رب العالمین کے نام سے شروع۔

''طواف عشق''

نیل گواہان عصاء ہے......

وقت کے لمحے اور دریا کی لہریں ایک جیسی نہیں رہتیں لیکن وہ پانی کہیں نہ کہیں تو موجود ہوگا جس نے عصاء نبی کی ضرب پر لبیک کہا ہوگا......

لبیک کہنے، بیت اللہ کا حج کرنے، حاجی قاہرہ کی زمین پر قافلہ در قافلہ اتر رہے ہیں......

صبح کا پیام، دن کے بیان میں بدل چکا ہے۔ مصر کے قاہرہ میں، گرم موسم میں، ٹھنڈی ہوا کی آمد کو حجاج کرام کی خوش قدمی قرار دیا گیا ہے۔ گھوڑوں کے ٹاپوں کی دھمک، ہجوم کے جوشیلے نعروں کا شور، گلی کوچوں، بازاروں، اونچے نیچے راستوں اور زمین کے خالی قطعوں پر کھڑے قاہرہ کے لوگوں کا صبر قابل دید ہے۔ ''محمل شریف'' کے لیے آنکھیں نم، دل محبت کی گرمی سے نرم، اور روحیں ابدی سکون کی گھڑی میں چند سانس لینے کے لیے انتظار بنی کھڑی ہیں۔ سر پر شرینی کے ٹوکرے رکھے، خوانچہ فروشوں کی آوازوں کے لفظ وہی ہیں بس تاثر بدلی ہوئی ہے...... آج کے دن...... ایک آج کے دن......

حج پر جانے والے خوش نصیب ہیں، لیکن بد نصیب وہ بھی نہیں۔ یوم جمعہ ہے...... اذان ظہر سے پہلے، قیام جمعہ سے پہلے، خلیفہ کے شاہی دستے آگے اور پیچھے، دائیں اور بائیں چلتے ہوئے فخریہ اس اعلیٰ نسل اونٹ کو ساتھ لا رہے ہیں جس کی سعادت مند کوہان پر ''محمل شریف'' سوار ہے......

عرش کا نشان، زمین کا جلال...... ''بیت اللہ'' کا کسوۃ الکعبہ (غلاف)

کلاموں میں کلام...... ابن کلام...... قرآن پاک......

اس شاہی قافلے کو دیکھنے کے لیے قاہرہ کے لوگ گھروں سے باہر نکل آئے ہیں، گھروں کی چھتوں پر چڑھ

گئے ہیں۔جھولوں کے بچے تک نہیں چھوڑے گئے ،وہ بھی اس وقت اپنی ماؤں کی گودوں میں ہمکتے ہوئے محمل شریف کی راہ دیکھ رہے ہیں۔جن گھروں سے قافلہ دکھائی دینے والا ہے،ان گھروں کی چھتوں پر پرندے تو بہت پر مار رہے ہیں لیکن عورتیں کسی کو پر نہیں مارنے دے رہیں اور منڈیر کی طرف کسی مائی کے لال ، پیلے، نیلے کو کھڑا نہیں ہونے دے رہیں۔وہ صبح سویرے جاگی ہیں،اپنے کام ختم کیے ہیں، کپڑے بدل کر، خوشبو لگا کر، باوضو ہو کر چھتوں پر آ کر مطلوبہ جگہ پر قبضہ کیا ہے......اب جو آنے میں دیر کر چکے ہیں، بہتر ہے کہ اگلے سال تک انتظار ہی کریں۔

ہوا سے ان کی چادریں اور لباس کے دامن پھڑ پھڑا رہے ہیں۔خطہ زمین پھولوں سے خالی ہو چکا ہے، قاہرہ والیوں نے اپنی جھولیاں پھولوں سے بھر لی ہیں۔بیت اللہ کی دیواریں چومنے خوش نصیب جا رہے ہیں لیکن بدنصیب وہ بھی نہیں ہیں۔گود کے جو بچے رونے کی غلطی کر رہے ہیں وہ ماؤں کی زبردست نظریں سہہ رہے ہیں، فرشتے چپکے چپکے ننھے فرشتوں کو اشارے دے رہے ہیں کہ وہ چپ رہیں ورنہ ان کی خیر نہیں......

خیر کو اپنے دامن میں سمیٹ کر، بل دار سیڑھیاں چڑھ کر، ہانپتے ہوئے وہ بھی چھت تک پہنچ چکی ہیں۔ان کی جھولیاں بھی پھولوں سے بھری ہوئی ہیں۔وہ بھی باوضو ہیں،خوشبو لگا کر، دل میں رب کائنات کی تسبیح بیان کرتے ہوئے ،وہ بھی کاروان حج کے ساتھ جانے والے غلاف کعبہ اور کلام پاک کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہیں......

جنت......

آمنہ......

اور عزیزہ......

دل کے بیان میں حج پر جانے والے تبرکات کا قیام شامل ہو چکا ہے۔موسم گرم ہے اور گرم ہی قاہرہ والیوں کا مزاج ہو رہا ہے۔پتا نہیں قاہرہ میں اتنی عورتیں کہاں سے نکل آئی تھیں۔اوپر آسمان تو کھلا تھا لیکن چھتوں پر دم گھٹ رہا تھا۔منڈیر کی طرف کھڑی قاہرنیں، جاہلی، فسادی، جلی بھنی کبابی بنی ہوئی تھیں۔انہیں ہاتھ لگانے کی دیر ہوتی تھی اور وہ بھڑک کر کہنی دے مارتی تھیں۔پیچھے والیاں ایڑیاں اچکا اچکا کر دیکھنے کی کوشش کرتے کرتے تھک

گئی تھیں۔وہ تینوں بھی اسی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھیں لیکن وہ ہلاک بھی ہو جاتیں تو بھی انہیں محمل شریف دکھائی نہیں دے سکتا تھا۔یہ الگ بات تھی کہ ان کی روح آسمان کی طرف پرواز کرتے ہوئے کچھ دیکھ دیکھ لیتی......

''مہربانی ہو گی آپ کی، ذرا آگے کھسک جائیں......''عزیزہ نے بڑے منت بھرے انداز سے ضعیفہ سے کہا تھا۔وہ قاہرہ میں تو پرانی تھی لیکن ایسی چھتوں پر چڑھنے میں نئی تھی، ورنہ ایسی منت کرنے کی غلطی نہ کرتی۔

''مجھ سے نرمی کی امید نہ رکھنا، سارا سال انتظار کیا ہے میں نے۔آج جی بھر کر دیکھوں گی اور کسی کا لحاظ نہیں کروں گی۔''ضعیفہ نے روکھے انداز میں کہا۔

عزیزہ نے گردن موڑ کر جنت اور آمنہ کو دیکھا کہ اب کیا کریں۔یہ ان کا چھٹا گھر تھا جس کی چھت پر وہ آئی تھیں۔پچھلے پانچ گھروں کی چھتوں پر بھی ان کے ساتھ یہی ہوا تھا۔راستے کے اس اور اس طرف جتنے گھر دکھائی دے رہے تھے سب کی چھتوں کا یہی حال تھا۔دو درویش کا گھر شہر کے کونے میں تھا، وہاں سے محمل کو نہیں گزرنا تھا۔جہاں سے گزرنا تھا وہاں کھڑے ہونے کی جگہ تو مل رہی تھی لیکن جھک کر محمل دیکھنے کی نہیں۔انہوں نے آنے میں دیر بھی نہیں کی تھی، پھر بھی......

ایک بار پھر سے عزیزہ نے آگے ہونے کی ناکام کوشش کی اور جواب میں بڑی عمر کی خواتین کے ہاتھوں کہنیاں، دھکے، دھموکے اور نوچ کھسوٹ وصول پائے۔وہ ایسے تشدد کی عادی نہیں رہی تھی، اس لیے ہکا بکا رہ گئی تھی۔ایک نے تو اس کے بال کھینچ کر کہا تھا۔

''مجھ بے چاری بوڑھی کو دیکھ لینے دو، تم تو جوان جہان ہو، ابھی تو بہت دیر تک زندہ رہو گی۔میری کیا خبر آج یہاں بیٹھی ہوں اگلے سال قبرستان میں لیٹی ہوں......مجھ بڑھیا کو دیکھ لینے دو......''عاجز بڑھیا نے، قاہر جلاد بن کر کہا......

''یہ بات سنتے سنتے میں نانی بن گئی، میرے سیاہ بال سفید ہو گئے، لیکن تم ابھی تک نہیں مری خالہ! تم ہمیں مار کر نہیں مرو گی لیکن ہمیں جلا کر ضرور مروں گی۔''کسی ایک نے جل کر کہا تو ساری عورتیں قہقہے لگانے لگیں۔

''تم نے آبِ حیات پیا نہیں لیکن سونگھا ضرور ہے......اب وہ پیالہ تو ڈھونڈ ہی ڈالوں خالہ!''

''تمہارے سر سے پھوڑ کر توڑ دوں؟ سب جلتی ہو مجھ سے......''

جلی ہوئی عزیزہ بھنا بھی گئی۔اس کی چادر عورتوں کے ہجوم میں پھنس گئی تھی،اس نے چادر چھڑوانے کی کوشش کی،اسے زور لگا کر کھینچا تو وہ ریشم کی طرح پھسلی اور وہ دور جا گری......عورتوں نے ذرا کی ذرا پلٹ کر اسے دیکھا اور پھر سے ضعیفہ سے مذاق کرنے لگیں۔وہ اپنے گھٹنے مسلنے لگی تھی۔جنت اور آمنہ کھی کھی کر رہی تھیں۔

''ساری تکلیفیں میں ہی سہوں،عورتوں کے ٹھونگیں بھی کھاؤں اور یہ تھپڑ بھی۔''وہ بے چاری بڑی تکلیف میں تھی شاید۔اس کی گھنی کالی بھنوئیں،اس کے چہرے کی سب سے نمایاں شے......اس کی خفگی کو نمایاں کر رہی تھیں۔اس کی جھولی سے گر کر بکھرے پھول......

عورتوں کے غول سے الجھ کر گری پوری کی پوری وہ......جنت کو اس پر بہت پیار آیا اور آگے بڑھ کر وہ اس کے پھول سمیٹنے لگی......س......اس کے پھول سمیٹنے لگی......

''میری بینائی کمزور ہے۔میں دن کے اندھے پن کا شکار ہوں۔مجھے جگہ دے دیں۔''آمنہ نے اس صفائی سے جھوٹ بولا تھا کہ گھٹنے مسلتے عزیزہ نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔پھول سمیٹتی جنت کے ہاتھ ساکت ہو گئے تھے۔وہ گردن کو خم دے کر ''حیرت پن'' سے،دن کے ''اندھے پن'' کا شکار آمنہ کو دیکھ رہی تھی۔

''میں رات کے بہرے پن کا شکار ہوں۔مجھے دن کے اندھوں کی باتیں سنائی نہیں دیتیں۔''اس کے آگے کھڑی عورتیں بھی جھوٹ کا منہ توڑنا جانتی تھیں۔

عزیزہ اور جنت کی ہنسی ایکدم سے چھوٹی تھی۔''او!دن کے اندھے پن کا شکار لڑکی!ایسے ہولناک جھوٹ بول کر بھی جگہ نہیں ملی،ڈوب مرو......نیل کے پانی میں چار چھ مچھلیاں غم سے دم توڑ چکی ہوں گی۔''اس نے لنگڑا کر کھڑے ہونے کی کوشش کی،پھر ڈھیر ہو گئی۔

''تو جا کر انہیں پکڑ کر پکا کر کھا جاؤ،بات بات پر تمہیں نیل بہت یاد آیا ہے،تمہارا چاچا لگتا ہے......؟''

''نہیں......چاچا کیوں لگے گا......ماما لگتا ہے ناں......''عزیزہ اپنے گھٹنے کی تکلیف پر صبر کر چکی تھی۔کیا فائدہ ہوا زخمی ہونے کا جھوٹ گھڑنے کا۔کسی نے پھر بھی ہمدردی میں اسے آگے آنے کی جگہ نہیں دی۔

''قاہرہ کی عورتیں پتھر دل ہیں......''عزیزہ نے ایک آخری کوشش کی تھی عورتوں کو شرم دلانے کی۔

''قاہرہ کی عورتیں دریا دل بھی ہیں،ڈبو ڈبو کر مارتی ہیں۔''ایک نے پلٹ کر کامل اطمینان سے،شرمائے

بغیر کہا۔

گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں قریب آ رہی تھی۔منڈیر کے قریب بیٹھی عورتیں جوش سے نعرے لگا رہی تھیں۔تینوں نے حسرت سے انہیں دیکھا۔کیسے بد اخلاق لوگ تھے، تین بے چاری لڑکیوں کو محمل شریف دیکھنے کے شرف سے محروم رکھ رہے تھے۔

''آؤ میرے ساتھ......'' با اخلاق لڑکی نے کھڑے ہوئے، چلا کر کہا۔جنت کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور سیڑھیاں اترنے لگی۔ہوا کے تیز جھونکے ان کی چادروں میں سما گئے اور انہیں لہرانے لگیں۔

''کہاں جا رہی ہو عزیزہ......'' سیڑھیاں اترتے، ہانپتے، کانپتے، دن کے اندھے پن کا شکار آمنہ پوچھ رہی تھی۔

''مسجد......'' پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر اس نے کہا۔سیڑھیاں وہ اتر چکی تھی، اب گھر سے باہر نکل رہی تھی۔

''ہم اور مسجد......کچھ خدا کا خوف کرو......اللہ کا گھر ہے وہ......'' شور کی وجہ سے آمنہ کو چلا کر کہنا پڑا تھا۔

''ہم بھی اللہ کے ہی بندے ہیں۔دیکھنا سب سے بلند جگہ ملے گی ہمیں۔پھول سیدھے محمل پر گریں گے۔'' بچوں، مردوں، عورتوں کو دھکیلتے ہوئے وہ مسجد کی سمت تقریباً بھاگتی ہوئی جا رہی تھی۔آوازیں بتا رہی تھیں کہ محمل بس قریب ہی ہے۔

''آج کے دن بھی یہی ہلاکت خیز گناہ ہوں گے......'' تیزی سے بھاگتے ہوئے وہ ایک محترمہ سے ٹکرا گئی، جس نے جل کر کہا۔

''مجھے معاف کر دیں......'' اس کے ایسے کٹیلے انداز پر عزیزہ ہنس دی۔صبح سے اسے دھکے ہی مل رہے تھے تو دو چار اس نے بھی لوٹا دیے......حساب برابر رکھنا چاہیے ناں......

''دانت نکال کر مجھ سے معذرت کر رہی ہو۔اور یہ تم کہاں بھاگی پھر رہی ہو؟''

''ہمیں کہیں جگہ نہیں ملی تھی تو ہم مسجد کی طرف جا رہی ہیں، شاید وہاں......'' آمنہ نے دانا بنتے ہوئے کہا جیسے یہ خیال اسے ہی تو آیا تھا۔عزیزہ آمنہ کو گھورے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

''بڑی چالاک ہو، یہ خیال مجھے کیوں نہیں آیا......پر میرے گھٹنے مجھے سیڑھیاں نہیں چڑھنے دیں گے......''

''اور دیواریں پھلانگنے بھی......'' کہتے ہوئے عزیزہ اس کے قریب سے گزر جانے لگی لیکن اس نے......

''تم ہو کون؟ تمہیں پہلے کبھی یہاں نہیں دیکھا......'' نظر آمنہ اور جنت پر، سوال عزیزہ سے۔

عزیزہ کے چہرے کے رنگ بدلے۔ غیر محسوس تینوں نے اپنے چہرے پر نقاب کھینچ لینے کی کوشش کی۔ ان کے پاس جواب تو تھا لیکن جرات نہیں تھی۔ وہ آج کے دن...... محمل کو دیکھنے کے دن...... حاجیوں سے بھرے قاہرہ

......قاہرہ میں تیار کاروان حج کے دن......

کیسے بتا دیتیں کہ وہ کون ہیں......

''کاروان کے ساتھ ہو؟ ہاں مہمان ہی لگتی ہو، وہاں جا کر میرے لیے بھی دعا کرنا۔''

''ہم کاروان میں شامل نہیں ہیں۔ ہم وہاں کیسے جا سکتی ہیں بھلا......؟؟ جنت نے اداس ہو کر کہا۔

''جیسے مسجد کی طرف بھاگی جا رہی ہو، ویسے ہی اللہ کے گھر کی طرف بھی بھاگ کر چلی جاؤ۔ میرے تو گھٹنوں نے بے وفائی کی ورنہ میں تو کب کی جا چکی ہوتی۔''

''دوڑ کر صحرا پار کر لیتیں؟'' آنے والے وقت کے بہرے پن کا شکار لڑکی، حیران ہوئی۔

''میں تو اُڑ کر آسمان بھی پار کر لیتی......بس کم ہمتی لے ڈوبی......تم یہ کم ہمتی نہ دکھانا......'' پتا نہیں مذاق تھا یا صلاح۔ خاتون سنجیدہ تھی......خاتون دانا تھی......خاتون فرشتہ تھی......خاتون پیامبر تھی......

سارا قاہرہ، سارا عالم کاروانِ حج کے ساتھ ''بیت اللہ'' جا سکتا تھا لیکن وہ نہیں......وہ نہیں......وہ واقف حال تھیں۔

بچے مسجد کے قریب و جوار میں بھاگے پھر رہے تھے۔ نعرے لگا رہے تھے۔ وہ مسجد کی سمت بھاگ گئیں۔ اُوپر کی طرف جاتی سیڑھیاں چڑھ کر، مشکل سے ہی سہی لیکن وہ مسجد کے گنبد تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئیں۔ انہوں نے کبھی دیواریں وغیرہ پھلانگیں تو نہیں تھیں لیکن اب ایک دوسرے کے ہاتھوں کا سہارا لے کر وہ دیواریں پھلانگ کر گنبد کے چبوترے تک پہنچ چکی تھیں۔ سب سے پہلے عزیزہ کھڑی ہوئی تھی اور اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا تھا......

اتنی بلندی سے شہر کے نظارے کا یہ اس کا پہلا موقعہ تھا۔ یہ خیال قاہرہ کی عورتوں کو کیوں نہیں آیا تھا۔ یہاں

سے محمل صاف دکھائی دے سکتا تھا۔ پھول بھی عین اس کے اُوپر پھینکے جا سکتے تھے۔ گول گنبد کے کنارے کھڑے ہونے کی جگہ کم تھی، اگر ان کے قدم ڈگمگا جاتے تو وہ سیدھی نیچے گرتیں۔ محمل کے قدموں میں.......لیکن.......

لیکن فی الحال وہ گنبد کی منڈیر پر کھڑی تھیں۔ ان کے شفاف چہرے، اور روشن آنکھیں، سورج کی آنکھوں کی گرمی اور نرمی سے نبرد آزما تھیں۔ وہ قاہرہ کے کسی بھی گھر سے زیادہ بلندی پر موجود تھیں۔ چھ گھروں سے انہیں دھکے اسی لیے ملے تھے، تاکہ وہ ساتویں گھر، اللہ کے گھر سے، اللہ کے گھر جانے والا کسوۃ الکعبہ اور کلام پاک دیکھ لیں۔ نیت ورنہ ارادہ باندھ لیں۔ تیز ہوا سے ان کے دامن پھڑ پھڑا رہے تھے۔ شدت جذبات سے محبت اترا رہی تھی۔

محمل شریف (اہرام مصر کی ساخت کا بنا ڈھانچہ، جس میں کلام پاک اور غلاف کعبہ ہوتا ہے)، قاہرہ کا ہجوم اور شاہی دستے قریب آ رہے تھے۔ حج پر نصیب والے جاتے ہیں، جو پیچھے رہ جاتے ہیں وہ نصیب جاگ جانے کی دعائیں مانگتے ہیں۔ دُور سے آنے والے، پیچھے رہ جانے والوں کی آنکھوں کے قریب آ رہے تھے۔ غیر محسوس تینوں نے چادریں کھینچ کر چہروں کو چھپا لینا چاہا.......متبرکات کو ایسے کھلے منہ دیکھنے سے انہیں شرم آئی۔ انہیں یقین تو حاصل تھا لیکن شک بھی ان کے ساتھ تھا کہ وہ ان متبرکات کو دیکھ سکتی ہیں اور نہیں بھی۔

حافظ قرآن ماؤں کے حافظ قرآن معصوم دل بچے، غلاف کعبہ کے لیے کپڑا بنتے ہیں، پھر اس پر آیات لکھتے ہیں۔ حافظ قرآن باپوں کے حافظ قرآن بچے، بیت اللہ جانے والا ''کلام پاک'' لکھتے ہیں.......

ایسی حفظ، حفظ محبت سے.......ایسے والہانہ سیاہ رنگ عشق سے آنکھیں چار کرنے سے انہیں شرم آئی.......

لیکن.......

تینوں کی نظر ایک ساتھ محمل شریف پر پڑی تھی۔ وقت پر نہ جانے کیا گزری لیکن ان کے لیے ہستی جاہ و جلال، ہستی روح و کمال، خاک ہوئی.......

نبیوں کی سواری، عاجزی کی نشانی، چوپایوں میں درویش چوپائے اونٹ نے سر اٹھایا.......انہوں نے سر جھکایا اور دیکھا۔ وہ قاہرہ سے ہی تھیں لیکن شہر کے دوسرے کنارے سے۔ انہوں نے کبھی محمل کو دیکھنے کا گناہ نہیں کیا تھا۔ وہ کلام پاک، غلاف پاک کو اپنی ناپاک نظروں سے دُور ہی رکھنا چاہتی تھیں۔ تب ان کے نام کچھ اور تھے

لیکن اب وہ نام بدل چکی تھیں۔ توبہ کر کے تائب ہو چکی تھیں۔ شہر کے دوسرے کنارے سے اس کنارے کی طرف ہجرت کر چکی تھیں۔

شہر کا وہ کنارا جو "قحبہ خانہ" کہلاتا ہے......

شہر کا یہ کنارا جہاں محمل اپنی شان دکھاتا ہے۔

جیسے زمین کے کنارے، ویسے آسمان کے کنارے، نہ ختون نہ سیڑھیاں، بس درجے اور منزلیں......

نماز شرف ملاقات...... حج شرف عشق دیوانہ وار ہے......

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

کلام پاک، غلاف پاک، نے ان کی بے نور آنکھوں کو نور، نور کر دیا تھا۔ قاہرہ کے رہنے والوں کی آوازیں حمد و ثناء سے معطر تھیں۔ کائنات کی خاموشی، اس عطر سے واقف تھی۔ وہ بھی زیر لب حمد و ثناء کر رہی تھیں۔ دیوانہ وار پھول پھینک رہی تھیں۔

"سبحان اللہ"، بے ساختہ آمنہ نے تعریف کی۔

"الحمد اللہ"، جنت نے اب جانا تھا کہ شکر کا لمحہ کب آتا ہے۔

"ان شاء اللہ"، عزیزہ نے دل کی دعا، روح کی نیت پر کہا۔

انہوں نے زندگی میں کبھی ایسی خوشی حاصل نہیں کی تھی، جو اس وقت کر چکی تھیں۔ جب تک محمل نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا تھا وہ وہیں کھڑی رہی تھیں۔ پھر تینوں ایک ایک کر کے گنبد کے چبوترے سے کود گئیں۔ نماز جمعہ کا وقت ہونے والا تھا۔ مسجد میں نمازیوں کی تعداد بڑھنے لگی تھی۔

"تم سب کہاں سے آ رہی ہو؟" وہ مسجد کی سیڑھیاں اتر کر وضو کے لیے حوض کی سمت جا رہی تھیں کہ مسجد کے خادم نے حیران پریشان ہو کر پوچھا۔

"ہم اوپر تھیں...... محمل شریف دیکھنے گئی تھیں......" عزیزہ جرات مند تھی۔ حق پر بھی تھی۔

خادم کا منہ بن گیا۔ "یہ مسجد ہے، اہرام نہیں کہ تم کودتیں پھلانگتی اوپر چڑھ جاؤ۔"

"یہ اللہ کا گھر ہے اور اللہ کے گھر پر اللہ کے ہر بندے کا حق ہے۔ ہم نے مسجد کے کسی بھی حصے کی بے حرمتی

نہیں کی۔"

خادم حیران عزیزہ کو دیکھ رہا تھا۔ "تمہاری زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے......"

"یہ قینچی تمہیں کاٹ نہ دے۔ ذرا پیچھے ہٹ جاؤ، ہمیں نماز بھی پڑھنی ہے......" جنت دونوں کے درمیان میں سے جگہ بناتے ہوئے حوض کی سمت بڑھ گئی۔

مسجد میں حج پر جانے والے نمازیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ عورتوں کا حصہ بھی کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ وہ تینوں ایک ایک کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔

"آپ تو بہت خوش ہوں گی ناں؟" نماز جمعہ کے بعد وہ ایک سیاہ فام عورت کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ پوچھے بغیر رہا نہیں گیا تھا۔

عورت عاجزی سے ہنس دی۔ "الحمد اللہ! کیا نام ہے تمہارا؟"

"میرا نام عزیزہ ہے، میں ایک بہادر لڑکی ہوں۔ یہ جنت ہے، اس جیسی ڈرپوک لڑکی پورے مصر میں نہیں ملے گی۔ اور یہ آمنہ ہے یہ کسی نہ کسی بیماری کا شکار رہتی ہے، کچھ دیر پہلے یہ اندھے پن کا شکار تھی، کچھ دیر بعد یہ لنگڑے پن کا شکار ہو جائے گی۔ یہ صورتحال کے ساتھ ساتھ اپنی بیماریاں بدلتی ہے، ویسے اس کی سب سے بڑی بیماری اس کا انسان ہونا ہے......"

عورت کتنی ہی دیر تک ہنستی رہی۔ "بہنیں ہو؟"

"نہیں......سہیلیاں...... بہت خوش قسمت ہیں آپ، ایسا کریں مجھے بھی اپنے ساتھ لے جائیں۔" عزیزہ نے جھجکے بغیر کہا۔

"میرے اختیار میں ہو تو میں ایک ایک مسلمان کو اپنے ساتھ لے جاؤں۔ وہاں جا کر میں تم تینوں کے لیے دعا کروں گی۔ تم تینوں کا نام لے کر کروں گی۔ جب میرے گھر کے سامنے سے قافلے گزر گزر کر جایا کرتے تھے تو میں بھی چلا چلا کر ایک ایک سے کہتی تھی کہ ام ہانی کا نام لے کر دعا کرنا کہ وہ اللہ کے گھر کا سفر اختیار کرے۔ پتا نہیں کس کی دعا مجھے لگ گئی ہے۔ میں نے اور میرے شوہر نے نو سال مٹی کے برتن بنائے ہیں پھر بھی کسی قافلے کے ساتھ آنے کی جرات نہیں کر سکے۔ ہم نے اپنے پیٹ نہیں کاٹے، نفس کاٹے ہیں۔ ایک بار سب چوری ہو گیا

تھا۔میرے جانور مر گئے ،بارشوں نے گھر تباہ کر دیا...... یہ دسواں سال تھا،پھر گیارھویں سال میں نے اسباب کی بجائے اعمال جوڑنے شروع کر دیے۔میں نے ضد کے گھڑے کو چاہت کے پانی میں بدل دیا۔سفر کے شوق کو،محبت کی لبیک میں،اور ایسے میرا قرعہ نکل آیا۔میرے شہر کی صاحب حیثیت عورت نے میرا سفر خرچ ادا کیا ہے۔مجھ کوئی بھی بنے ،حکم بس ایک کا ہی چلتا ہے،اور تب ہی سب ہوتا ہے......"

محبت کی لبیک......حکم......عمل......چاہت کا پانی......

سب سوال اور سب جواب ختم ہو گئے۔تینوں چپ چاپ،مسجد سے باہر آ گئی تھیں۔بازار سے ہو کر،گلیوں سے گزار کر شہر کے اجاڑ کنارے پر آباد،درویش کے درویش صفت گھر کی سمت......میدان میں بچے فرضی شیطان کو کنکریاں مار رہے تھے۔

"میں حج پر جانا چاہتی ہوں......" چلتے چلتے رک کر عزیزہ نے کہا۔"وہ ہمارے رب کا گھر ہے،اس پر ہمارا بھی حق ہے۔"

"ہم صاحب اعمال نہیں ہیں عزیزہ!ہم صاحب گناہ گار ہیں......" آمنہ کو عزیزہ کی بات سن کر حیرت ہوئی تھی۔

"ہمارا ماضی ہمارے فرائض کے راستے میں کھڑا نہیں ہو سکتا۔توبہ میری ڈھال بن چکی ہے،اس پر مایوسی کا ہتھیار نہ چلاؤ۔ہم بھی کسی عام مسلمان کی طرح انسان ہیں۔ماضی ہمارا انجام طے نہیں کر سکتا۔وہ ہمارا سامان سفر،تباہ و برباد نہیں کر سکتا۔"

دونوں اس کی شکل دیکھ رہی تھیں......

"میں نے اس رب کے لیے سب کچھ چھوڑ دیا،اس نے مجھے ہدایت دی تو میں نے بھی "لبیک" کہا۔میرے گناہ سیاہ سمندر،اس کا رحم بے کنار بحر۔میرے گناہ زمین سے آسمان،اس کی بخشش ساتوں آسمان......"

"بے شک" آمنہ نے بے ساختہ کہا۔

"کیا تم دونوں نے بھی یہی نہیں کیا؟میرا حسن جو چاند کا ٹکڑا تھا،میں نے اسے کمتر سمجھا تو کس لیے؟مخلوں

سے نکل کر خود کو خاک کیا تو کس کے لیے؟ کس چیز نے مجھے ایسے بدرنگ پھٹے پرانے کپڑے پہننے پر مجبور کر دیا؟ وہ کیا ہے جس کے آگے ریشم و کمخواب بے حیثیت ہیں؟ ہیرے جواہر پتھر کے ٹکڑے ہیں؟'' کھیل کود کرتے بچوں کے شور کی وجہ سے اسے اپنی آواز بلند کرنی پڑی تھی۔ دونوں خاموش تھیں۔

''کیا یہ سب میں نے اپنے رب کے لیے نہیں کیا؟ راہ حق پر چلنے کے لیے میں نے ایک بھی بار پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھا۔ کسی چیز کی لالچ نے میرا دامن نہیں کھینچا۔ ہمارا رب...... جس کی محبت میں ہم نے سب کچھ چھوڑ دیا...... دنیا کو خاک کیا اور عرش والے کے لیے اہتمام کیا۔ نماز قائم کی اور روزوں کے لیے تیاری کی...... تو کیا اس رب کے گھر کے طواف پر ہمارا حق نہیں؟''

''ہم کاروان حج میں شامل نہیں ہو سکتے، نہ اس سال، نہ آنے والے کسی سال۔'' جنت کو اس کی نیت ٹوٹنی ہی پڑی۔

''یہ اہتمام اللہ کو کر لینے دو......'' اس کی نیت ارادے میں بدل چکی تھی۔

''ہمیں یہ سفر کوئی اختیار کرنے نہیں دے گا......'' آمنہ نے حقیقت بیان کی۔

''یہ اختیار، اختیار والا دیکھ لے گا......'' اس نے ''یقین'' کی ترجمانی کی۔

عزیزہ ان دونوں سے عمر میں چھوٹی تھی، اپنے گھنے بالوں کو وہ دو حصوں میں بانٹ کر بل دے کر نیچے گرہ لگا لیتی تھی۔ خاموش رہتی تھی تو بہت بھولی بھالی لگتی تھی، بولتی تھی تو ہوش اڑا دیتی تھی۔ یہ وہی تھی جس نے درویش کی تبلیغ پر توبہ میں پہل کی تھی۔ یہ وہی تھی جس کی وجہ سے وہ دونوں آج اس کے ساتھ تھیں۔ شہر کے اُس کنارے سے دور، شہر کے اس کنارے میں مشغول، درویش کے گھر، مسجد کے پڑوس میں، بدرنگ کپڑوں میں لیکن اجلی روح کے ساتھ۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

''میں جانتا تھا کہ میرا امتحان آنے والا ہے۔'' روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے درویش پانی سے بھری رکاب میں بھگو رہا تھا۔ یہ اس کا پسندیدہ کھانا تھا۔ اس کا اصل نام منان یوسف تھا لیکن وہ درویش کے لقب سے مشہور تھا۔

''امتحان خوش نصیبوں کو نصیب ہوتے ہیں۔'' بے ساختہ عزیزہ کے منہ سے نکلا تھا۔

''تم حج پر کیوں جانا چاہتی ہو؟'' وہ تینوں سے پوچھ رہا تھا۔ یہ سب لوگ چولہے کے پاس بیٹھے تھے۔ درویش کی بیوی روٹیاں پکا رہی تھی۔ جنت سب کو کھانا نکال نکال کر دے رہی تھی۔ عزیزہ کھا چکی اور آمنہ کا دل کھانے سے اٹھ چکا تھا۔

''بتاؤ جنت! کیوں جانا چاہتی ہو؟ تم تو صاحب حیثیت بھی نہیں ہو؟'' پہلا نوالہ اٹھا کر درویش نے اپنی بڑی بیٹی کی طرف بڑھایا اور اس کے منہ میں ڈال دیا۔

''میں صاحب چاہت ہوں درویش!'' اب جنت اپنے لیے کھانا نکال رہی تھی۔

درویش نے گہرا سانس لیا۔ ''اور تم آمنہ؟ کیوں جانا چاہتی ہو؟''

''فرض عبادتیں زمین کے کسی بھی حصے میں ادا کی جا سکتی ہیں۔ نماز زمین کے کسی بھی ٹکڑے پر پڑھی جا سکتی ہے، پانی، پہاڑ، صحرا، جنگل...... بارش، طوفان، گرمی، سردی...... رمضان کے روزے اور زکوۃ کی ادائیگی بھی۔ لیکن حج صرف ایک مقام پر ادا ہوتا ہے۔ میں اس ''ایک گھر'' جانا چاہتی ہوں۔''

''تو تم زیارتیں کرنا چاہتی ہو؟'' درویش نے دوسرا نوالہ چھوٹی بیٹی کے منہ میں ڈالا۔

''اللہ کو اجتماع پسند ہیں، سفر اور اہتمام سفر پسند ہے۔ ہمارا چل کر، دوڑ کر، بے تاب ہو کر، بے قرار ہو کر آنا۔ دنیا کے کناروں سے نکل کر مرکز کی طرف بھاگنا۔ قیامت کے دن بھی ایسا ہی ہو گا...... ہے نا درویش......''

''اور تم عزیزہ......؟'' درویش اپنا کھانا ختم کر چکا تھا۔ لمبے وقفے کے بعد وہ عزیزہ سے پوچھ رہا تھا۔

''لبیک کہنے درویش......'' وہ اس سے زیادہ، اس سے کم کچھ نہیں کہنا چاہتی تھی۔ درویش ہزار بار پوچھتا، وہ ہزار بار یہی جواب دیتی۔

''لبیک کہنے......؟'' گھٹنے کھڑے کر کے، درویش نے سر کو دیوار کے ساتھ لگا لیا تھا۔

''تم نے ایسی باتیں کیسے سیکھ لیں عزیزہ؟'' وہ زیر لب بڑبڑا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

امیر الحج...... امیر کارواں...... برکات ابن موسیٰ کو سر کھجانے کی فرصت نہیں تھی۔ تین دن بعد کاروان حج کی روانگی تھی۔ آج صبح اندلس سے آخری قافلہ بھی آ چکا تھا۔ کاروان میں حاجیوں کی تعداد دس ہزار کے قریب پہنچ چکی تھی۔ یہ بلاشبہ اب تک کا سب سے بڑا کاروان تھا۔ عالم اسلام میں اس کاروان کی روانگی کی جتنی دھوم تھی، امیر الحج پر اتنی ہی زیادہ ذمہ داریاں تھیں۔ کچھ حاسدین جل رہے تھے کہ عالم اسلام کا اتنا بڑا کاروان ابن موسیٰ کی سربراہی میں جا رہا ہے۔ کچھ دل والے خوش تھے کہ یہ رتبہ ابن موسیٰ کو حاصل ہو رہا ہے۔

رات کا آخری پہر تھا اور وہ میدان کاروان میں انتظامات دیکھنے میں مصروف تھا۔ اناج، جانور، شاہی دستے۔ دور، دور تک حاجیوں کے اونٹ ہی اونٹ دکھائی دے رہے تھے۔ خیمے تھے، گھوڑے، خچر اور کاروان کے ساماں تھے۔ وہ یہ سب دیکھ کر پھولے نہیں سما رہا تھا۔ اس کی سربراہی میں جانے والا یہ دوسرا کاروانِ حج تھا۔ پہلے کاروان کی واپسی پر، مصر میں اس کا شاندار استقبال کیا گیا تھا۔ اس نے بدوؤں کے حملے کو بری طرح سے پسپا کر دیا تھا۔ اس کی بہادری اور شجاعت کے ڈنکے بجنے لگے تھے۔

وہ مصر میں مقبول عام تھا۔ قاہرہ میں ہر دل عزیز تھا۔ لوگ اس سے محبت کرنے پر مجبور تھے۔ وہ ان کے دلوں کا سکون بن گیا تھا۔ بچے اسے دیکھ کر ''امیر الحج'' بننے کے خواب دیکھنے لگے تھے۔

''کیا آپ مجھے اپنے ساتھ حج پر لے جائیں گے۔'' اسے روک کر بچے یہ سوال کرنا پسند کرتے ہیں۔

''لیکن تم ابھی بہت چھوٹے ہو......'' وہ گھٹنوں کے بل بچوں کے گروہ کے پاس بیٹھ گیا۔

''کیا اللہ چھوٹے بچوں کو اپنے گھر آنے کی اجازت نہیں دیتا؟''

''بالکل دیتا ہے...... لیکن تم اتنا لمبا سفر نہیں کر سکو گے...... والد یا والدہ کے ساتھ جا سکتے ہو......''

''والد کہتے ہیں وہ غریب ہیں، والدہ کہتی ہیں وہ غریب کی زوجہ ہیں۔ میں دو غریبوں کا معصوم ''بیٹا'' ہوں، کیا کروں اب؟''

''اب تم دو غریبوں کے امیر ہونے کی دعا کرو۔'' برکات ابن موسیٰ ہنسے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

''آپ امیر الحج کیسے بنے؟'' غریب بچے کے ساتھ کھڑے امیر بچے نے پوچھا۔

''میں......؟ میری والدہ حج کرنے کے لیے گئی تھیں اور پھر واپس نہیں آ سکی تھیں......'' گہرا

سانس...... گہری آہ......

"آپ بدووں سے بدلہ لینے کے لیے امیر الحج بنے؟ والد کہتے ہیں آپ نے بدووں کو مزا چکھا دیا تھا۔"

وہ ہنس دیتا، رونا چھپالیتا، وہ ساری دنیا کے بدووں کو مزا چکھا دیتا تو بھی والدہ کو واپس نہیں لاسکتا تھا۔ جو اس کی پیشانی چوم کر اونٹ پر سوار ہوئی تھیں، وہ پھر فرشتہ اجل کے ساتھ پرواز کر گئی تھیں۔ ان دنوں وہ ہر روز کاروان کی واپسی کی راہ دیکھا کرتا تھا۔ شہر کے جس کنارے سے اس نے والدہ کو رخصت کیا تھا، اس کنارے پر کھڑا ہو کر وہ انہیں خوش آمدید کہنے کے لیے بے تاب رہتا تھا۔ بیوہ ماں کے بچوں کے پاس انتظار کے سوا ہوتا ہی کیا ہے۔ دکھائی دینے والی ایک صورت، سنائی دینے والی بس ایک آواز، تسلی دینے والا بس ایک دل...... ساری زندگی کا سرمایہ بس ایک "ماں"...... یتیم بچوں کے دل کی ہر ایک دھڑکن ماں کے دل کے ساتھ دھڑکتی ہے۔

جس دن کاروان واپس آیا، وہ پاگلوں کی طرح کاروان کے پیچھے بھاگا تھا، سارا شہر استقبال کے لیے موجود تھا۔ وہ ایک ایک اونٹ، ایک ایک حاجی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک ایک اونٹ کی سمت دیوانہ وار بھاگ رہا تھا لیکن اسے اپنی حاجن والدہ کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ سب حاجی اسے روک روک کر گلے سے لگا رہے تھے۔ اس کی پیشانی چوم رہے تھے، اس کی آنکھوں کے آنسو پونچھ رہے تھے جو ماں کو دیکھنے کی تڑپ میں بہہ نکلے تھے۔

"تمہاری والدہ بدووں کے حملے میں شہید ہو چکی ہیں میرے بیٹے......"

امیر الحج اس کے پاس آ کر اسے سینے سے لگا کر بتا رہے تھے۔ حج بھی اور شہادت بھی...... اتنے سارے حاجیوں کے سینے سے لگنے کے باوجود، صبر کی اتنی زیادہ تھپکیاں ملنے کے باوجود وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔ زمین پر ڈھیر ہو کر، زمین کی مٹی سے مٹھیاں بھر کر،

"اب زمین کی ہر شے مجھ سے زیادہ خوش قسمت کہلائے گی، وہ چولہے کی راکھ اور سوکھی گھاس کا تنکہ ہی کیوں نہ ہوا۔"

وہ روتا جاتا تھا، کہتا جاتا تھا۔ اس نے ہمیشہ حج سے واپس آنے والے دیکھے تھے، حج سے شہید ہو کر واپس نہ آنے والے نہیں دیکھے تھے...... دیکھا تو اپنی ہی والدہ کو......

حاجیوں نے اس کی جھولی مکے سے لائے تبرکات سے بھر دی تھیں، امیر الحج نے اسے تحائف دیے تھے لیکن...... دنیا میں ماں کا کوئی نعم البدل ہوسکتا تو پھر رونا ہی کس بات کا تھا۔ دنیا کے سارے خزانے، اور سارے رتبے ایک ماں دے سکتے تو تڑپنا ہی کس بات کا تھا۔

وہ کبھی یہ نہیں سمجھ سکا تھا کہ جو لوگ بے ضرر ہوتے ہیں، انہیں ہی سب سے زیادہ ضرر کیوں پہنچتے ہیں۔ جو اللہ کے راستے پر ہوتے ہیں انہیں ہی کیوں تلواروں کے زخم ملتے ہیں۔ کیا بدو جانتے نہیں کہ حاجیوں کا کیا مقام ہوتا ہے۔ وہ کاروان حج کو کیسے لوٹ سکتے ہیں۔ وہ بدوؤں سے پوچھنا چاہتا تھا کہ ایسی بیوہ عورت جس نے جوانی کو بڑھاپا کر لیا اور اکلوتی اولاد کی پرورش میں چکی پیس پیس کر رزق کمایا، ایسی عورت کو لوٹ کر، مار کر انہیں کیا ملا؟ کیا انہیں دکھائی نہیں دیا کہ اس کی پیشانی پر سجدوں کے نشان کتنے گہرے تھے، اور اس عورت کی عاجزی کیسی بلندی پر تھی۔ انہوں نے ایسی صابر عورت کو ہلاک کیوں کیا؟

اٹھارہ سال بعد وہ خود امیر الحج بن چکا تھا۔ یہ عام رتبہ نہیں تھا، دمشق سے چلنے والا کاروان حج اور قاہرہ سے چلنے والا کاروان کسوۃ الکعبہ...... عالم اسلام کے یہ دونوں کاروان، عالم اسلام کا فخر تھے۔ ایسا پل جو عازمین حج کو ان کی منزل تک پہنچاتے تھے۔ مصر اور دمشق کو اپنے کاروانوں پر فخر تھا۔ امیر الحج ہتھیلی پر جان رکھتا تھا اور خطروں کی شہہ رگ پر تلوار۔ اس کی لیاقت اور سمجھ کو للکارنا آسان نہیں تھا۔ خلفیہ امیر الحج کو مقرر کرتا تھا، اور امیر الحج حاجیوں کی آنکھ کا تارا بن جاتا تھا۔

پہلے کارواں حج میں اس نے بدوؤں کے دو حملوں کو پسپا کر دیا تھا۔ اس نے کسی حاجی پر آنچ نہیں آنے دی تھی۔ رات کا آسمان، آسمان کے چراغ گواہ تھے کہ اس نے ایک ایک حاجی کے حج سے برکت سمیٹی ہے۔ حاجی سفر کی جو داستانیں اپنے ساتھ لائے تھے، ان میں امیر الحج کی شجاعت اور لیاقت کی داستانیں سے سب نمایاں تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ مصر کی آنکھ کا ستارہ بن گیا تھا۔ خلیفہ اور سب بڑوں نے اس بار بھی کاروان کو اس کی سربراہی میں دیا تھا۔ اس کے نام پر اختلاف کی وجہ ہی نہیں بنتی تھی۔

درویش اسی امیر الحج کے پاس آیا تھا۔ وہ دونوں ایک ہی صف میں ساتھ ساتھ نماز پڑھ رہے تھے۔ مسجد میں حج پر جانے والوں سے صفیں بھری ہوئی تھیں۔ درویش دیکھ سکتا تھا کہ عرب و عجم ایک جماعت کا حصہ ہیں۔

''تم بلاشبہ خوش نصیب ہو امیر! تم پر خدا کی خاص رحمت ہے......''

''رحم سے مبرا تو آپ بھی نظر نہیں آتے......'' ابن موسیٰ نے ہنس کر کہا۔ دونوں میں دوستی کی نوعیت ایسی تھی کہ ملاقاتیں زیادہ نہیں ہوتی تھیں لیکن جب بھی ہوتی تھی محبت کی گرمی، اپنا سورج بلند رکھتی تھی۔

''دعا کے ہاتھ مت گرانا امیر! پہلے میرے ایک سوال کا جواب دو...... اللہ کو اپنا کون سا بندہ سب سے زیادہ عزیز ہوتا ہے؟''

''کوئی ایک بندہ تو عزیز نہیں ہوتا درویش!'' ابن موسیٰ حیران تھا کہ آج درویش اسے بار بار ''امیر'' کے لقب سے ہی کیوں بلا رہا تھا۔

''وہ جواب دو جو اس وقت تمہارے دل میں ہے......''

''جو خدا کے بندوں کو بلا تفریق تعظیم دے، نہ کوئی عربی نہ عجمی...... نہ کالا نہ گورا...... فوقیت بس عمل کی، باقی سب برابری۔''

''مجھے تمہارا جواب پسند آیا، تم سے اسی جواب کی امید تھی، کیا میری عمر کا لحاظ کر کے تم میرا ایک کام کر سکتے ہو امیر؟''

ابن موسیٰ نے قہقہہ لگایا۔ ''آپ مجھے بار بار امیر کیوں کہہ رہے ہیں؟''

''کیونکہ میری حاجت امیر الحج سے ہے، ابن موسیٰ سے نہیں۔ ابن موسیٰ میرا دوست ہے، اپنا دل بھی نکال کر رکھ دے گا۔''

''امیر الحج بھی آپ کے لیے دل نکال کر رکھ سکتا ہے......'' ابن موسیٰ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''کیا آپ پھر سے حج پر جانا چاہتے ہیں؟ اس کے لیے آپ کو اتنا تردد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ ہنس دیا۔ ''میں آپ کے لیے سواری اور خرچ کا انتظام کر سکتا ہوں۔''

''میں تین حصوں میں تقسیم ہوں...... کیا تم میرے تینوں حصے لے جاؤ گے۔''

''تین حصے...... یعنی تین لوگ...... ہاں میں تین حصوں کو لے جاؤں گا، لیکن آپ کے یہ تین حصے میری گردن پر زیادہ بھاری نہیں پڑنے چاہیے۔ اونٹ کے کوہان کی عظمت بلند ہے لیکن امیر الحج اپنی حد سے آگے

عظمت نہیں دکھا سکتا۔''

''عظمت اپنی حد سے آگے گزر جانا ہی ہوتا ہے امیر! قربانی اسے ہی کہتے ہیں جو ابراہیم نے کی، بھلا بیٹوں کی گردنوں پر چھریاں رکھی جاتی ہیں؟ حد میں رہ کر بھی کسی نے کبھی عظمت پائی ہے......؟''

ابن موسیٰ لا جواب ہو چکا تھا۔

''دیکھو تم مسجد میں بیٹھے ہو، رحمان کے حضور موجود ہو تم امیر الحج ہو......اپنے لفظوں سے نہ پھرنا۔''

''کسی کو زبان دے چکے ہیں آپ؟ ایسے پہلے کبھی اصرار نہیں کیا......''

''نہ زبان دی ہے نہ عہد کیا ہے......ایک امتحان آیا ہے، اس پر کھرا اترنا ہے......''

''آپ اور آپ کے امتحان درویش! اللہ والوں کو اپنی آزمائشوں کی بہت فکر رہتی ہے۔ فکر نہ کریں آپ کسی ایک آزمائش میں ناکام ہو گئے تو بھی آپ گناہ گار نہیں کہلائیں گے۔''

''تم سے ایسی بچکانہ بات کی امید نہیں تھی۔ انسان زندگی کے صحرا میں بھوکا پیاسا، در بدر پھرتا ہے اور پھر اسے رب کی محبت کا میٹھا پانی پینے کے لیے ملتا ہے کیا وہ دیوانہ وار اس کی سمت نہیں بھاگے گا؟ کیا چیز اسے روک کر رکھے گی؟''

''وہ جو بھی ہیں ان کے نام مجھے بتا دیں، میں اندراج کروا دوں گا۔ میں انہیں اپنے ساتھ ضرور لے کر جاؤں گا۔''

درویش کی نظر مسجد کے منبر پر ٹھہر گئی۔ ''تمہیں سچ بتانا ضروری بھی ہے اور میرا فرض بھی۔ وہ تینوں مصر کی مشہور طوائفیں تھیں......لیکن اب وہ تائب ہو چکی ہیں۔''

امیر الحج نے بدو کی تلوار کا وار اپنی گردن پر سہا تھا، شہ رگ کٹتے کٹتے بچی تھی۔ اسے خوف آیا تھا نہ تکلیف ہوئی تھی......لیکن اب اسے محسوس ہوا کہ اس کی شہہ رگ پر ایک وار ہوا ہے...... ''طوائفیں......'' اس لفظ کا......

''تھیں......وہ تھیں...... چھ مہینے سے وہ میرے ساتھ میرے گھر پر ہیں۔ رات دن چکی پیس کر محنت مزدوری کرتی ہیں۔ پانچ وقت کی نماز پڑھتی ہیں۔ رمضان کے روزے رکھتی ہیں، تہجد گزار اور فکر و عمل پر مائل ہیں۔ وہ تفسیر قرآن......''

امیر الحج نے ہاتھ بلند کر کے درویش کو روکا۔ اسے ان کی دینی لیاقت جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ ”درویش! مسجد میں بیٹھ کر ایسی باتیں نہ کریں......“

”میں نے ان کے نام بدل دیے ہیں...... آمنہ...... جنت...... عزیزہ...... کیا یہ نام مسجد میں نہیں لیے جا سکتے؟“ درویش نے اطمینان سے پوچھا۔ ”گناہ ہو جانے پر اللہ انسان کو زمین کے کناروں سے باہر نکل جانے کے لیے نہیں کہتا، لیکن تم جیسا انسان کہتا ہے۔“

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

امیر الحج بے یقینی سے درویش کو دیکھ رہا تھا۔ ”کیا آپ پاگل ہو چکے ہیں۔ آپ جانتے بھی ہیں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”ہاں بالکل! میں جانتا ہوں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ انہیں اپنے ساتھ حج پر لے جاؤ، اس سے بڑھ کر کیا نیکی ہوگی۔“

”نیکی؟ کیا آپ یہ اہتمام میری نیکی کے لیے کر رہے ہیں؟“ امیر نے طنزیہ پوچھا۔

”طنز نہ کرو ابن موسیٰ! تم اس خاتون کے بیٹے ہو جو صحرا میں شہید ہوئی، جس نے اکیس سال حج کی نیت باندھ کر رکھی اور محنت و مشقت کر کے تمہاری پرورش کی۔ تم اس خاتون کی اولاد ہو ابن موسیٰ! جس نے حج کا فریضہ ادا کیا اور شہادت کا درجہ پایا۔ تمہاری والدہ کی طرح انہوں نے بھی نیت باندھ لی ہے۔ بندگی کے صحرا میں، وہ بھی اس میٹھے پانی کی طرف دوڑ کر، ورنہ چل کر، ورنہ رینگ کر جانا چاہتی ہیں، جس سے سیرابی نصیب والوں کو نصیب ہوتی ہے۔ ان پر یہ حد نہ لگاؤ کہ مسجد میں بیٹھ کر تم ان کا ذکر سننا گوارا نہ کرو، ایسی نخوت نہ دکھاؤ، اتنے تکبر کا مظاہرہ نہ کرو......“

ابن موسیٰ بری طرح سے جز بز ہوا، وہ سمجھ گیا کہ درویش اب اسے ابن موسیٰ کے نام سے کیوں بلانے لگا ہے۔ اب وہ اسے کاروان کا امیر نہیں سمجھ رہا، ایک عام انسان سمجھ رہا ہے۔ اس نے اسے اس عہدے سے برخاست کر دیا ہے۔

”درویش میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو، میں امیر کاروان ہوں، خلیفہ نہیں...... آپ اچھی طرح سے

جانتے ہیں کہ کاروان حج کے ساتھ کسوۃ الکعبہ اور کلام پاک جا رہا ہے۔ عالم اسلام کو اس کاروان پر فخر ہے۔ مصر کے نیک سیرت، اعلیٰ حسب نسب کے بچے منتخب کیے جاتے ہیں، انہیں حافظ قرآن بنایا جاتا ہے، پھر وہ غلاف کعبہ کے لیے کپڑا تیار کرتے ہیں۔ یہ وہ بچے ہیں جن کے منہ سے کبھی کوئی گالی نہیں نکلی، جن کے والدین نیک چلن ہیں۔ عالم ہیں...... شاکر ہیں، صابر ہیں۔"

"میں یہ سب جانتا ہوں ابن موسیٰ، تم مجھے یہ کیوں بتا رہے ہو......؟"

"میں آپ کو یاد دلا رہا ہوں کہ یہ صرف حاجیوں کا کاروان نہیں ہے، یہ کاروان کسوۃ الکعبہ ہے۔ اور اس کاروان کے ساتھ "طوائفیں" نہیں جا سکتیں۔ وہ تائب ہی کیوں نہ ہو چکی ہوں۔ خلیفہ تک بات پہنچ گئی تو سارے عالم اسلام میں شرمندگی ہوگی۔ میں اپنے عہدے کی پرواہ نہیں کرتا، لیکن مصر کا فخر میرا فخر ہے۔"

"فخر......؟ کیسا فخر ابن موسیٰ...... تین مسلمانوں کو تم اپنے کاروان میں شامل نہیں کرنا چاہتے اور بات کرتے ہو فخر کی۔ وہ توبہ کر چکی ہیں۔ جسے ہمارا تمہارا رب قبول کر چکا ہے، تمہیں قبول کرنے میں کیا عار ہے؟ تم اللہ کے حکم کی خلاف عرضی نہیں کر سکتے۔ خدا کا فرمان ہے کہ توبہ کرنیوالا نومولود بچے کی طرح پاک صاف ہو جاتا ہے، اس کے گناہ زمین سے لے کر آسمان تک بلند ہی کیوں نہ ہوں۔"

ابن موسیٰ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ "میں اس فرمان پر یقین رکھتا ہو لیکن خلیفہ...... حجاج کرام......"

"اگر حج کے لیے جانے والوں کے دلوں میں اتنی وسعت نہیں تو انہیں اللہ کے گھر نہیں جانا چاہیے۔ اسلام آیا تھا تو باطل مٹ گیا تھا۔ باطل کو مٹا ہی رہنے دو ابن موسیٰ! تمہاری یہ باتیں حق کے خلاف ہیں۔"

ابن موسیٰ آج سے پہلے کبھی اتنی مشکل صورتحال سے نہیں گزرا تھا۔ "ایک کام کریں، آپ انہیں کاروان سے الگ بھیج دیں۔ میں انتظام کر سکتا ہوں۔ وہاں پہنچ کر میں ان کا خیال رکھنے کی کوشش کروں گا۔"

درویش کی آنکھوں کی سختی درشتی میں بدل گئی۔ "اچھا...... یہ خیال مجھے نہیں آیا ہوگا...... میرے کچھ سوالوں کا جواب دو ابن موسیٰ! نماز کی فضیلت جماعت کے ساتھ ہے یا اکیلے میں......؟ رمضان کے روزے آگے پیچھے ایک ہی مہینے میں تیس کیوں ہیں؟ وہ ہر سال کے ہر مہینے میں دو دو کیوں نہیں ہیں؟ سورتیں، آیتیں، پارے...... یہ الگ الگ ہیں تو نام ہیں، یہ یکجا ہیں تو قرآن ہے...... بتاؤ کلام پاک میں ایسا اتحاد کیوں ہے؟ حضرت محمد ﷺ نے

حضرت ابو بکر کو مدینے سے حج کے لیے سو لوگوں کو قافلے کی صورت میں لانے کی ہدایت کیوں کی تھی؟ وہ حاجی، دو دو، تین تین یا دس دس کی صورت میں کیوں نہیں گئے تھے؟ دفاع ہو یا حملہ...... سپاہیوں کی جماعت ''لشکر'' ہی کیوں ہے؟ وہ ٹکڑیوں میں کیوں نہیں؟''

ابن موسیٰ ششدر درویش کی صورت دیکھ رہا تھا۔ ''میں آپ جتنا باعلم نہیں ہوں درویش!''

''علم والے نہیں بن سکے تو ''عمل'' والا بن جاؤ......''

ابن موسیٰ نے خفگی سے درویش کی طرف دیکھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے درویش کو نظر انداز کر دیا، وہ کچھ اور لوگوں کی طرف بڑھ گیا جو اس سے کاروان سے متعلق باتیں کرنے لگے تھے۔ درویش چپ چاپ ابن موسیٰ کو دیکھتا۔ ابن موسیٰ اپنی پشت پر درویش کی نظروں کی گرمی محسوس کر رہا تھا۔

''اللہ کے گھر کے لیے تین دل لے جاؤ امیر الحج!'' درویش جیسے مراقبے سے بیدار ہوا تھا۔ اس کی آواز بلند تھی اور وہ سب کو سنائی دی تھی۔ سب نظریں ابن موسیٰ اور درویش کو دیکھ رہی تھیں۔

''رب الواحد'' کے لیے تین دل......

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

''تین عاشق، تین متوالے، تین دیوانے لے جاؤ امیر!'' درویش کی آواز ابھی بھی بلند ہی تھی۔ ابن موسیٰ نے حیرت سے درویش کی بچکانہ باتوں کو سنا۔ وہ خفا ہو چکا تھا۔ وہ درویش کی سمت لپکا۔ ''آپ سے ایسی کم عقلی کی باتوں کی امید نہیں تھی۔''

''تم سے ایسی تنگ دلی کی امید نہیں تھی......'' درویش نے افسوس سے کہا۔

''ایک اللہ'' کے لیے تین اللہ والے لے جاؤ......''

یہ آخری بات تھی جو درویش نے کہی اور ابن موسیٰ کو مسجد میں ہی چھوڑ کر باہر آ گیا تھا۔ ابن موسیٰ نے لپک کر درویش تک جانا چاہا تھا، اسے بتانا چاہا تھا کہ جس چیز میں اس کا اختیار نہیں، اس کے لیے اسے مجبور نہ کیا جائے۔ وہ اسے عزیز رکھتا تھا لیکن......

عزیزہ نے دیکھ لیا تھا کہ درویش اداس صورت لوٹے ہیں۔ اس کے دل کو دھکا لگا تھا۔ درویش کی شہر میں

بہت عزت تھی ۔ انہیں انکار کرنا مشکل تھا۔ اور اگر انہیں انکار ہو سکتا تھا تو اس کا مطالب صاف تھا کہ وہ مر کر بھی حج پر نہیں جا سکتیں ۔ ایکدم سے انہیں احساس ہوا کہ توبہ کر کے وہ رب کے قریب تو ہو گئی ہیں لیکن مخلوق سے آج بھی اتنی ہی دور ہیں ۔ آسمان پر ان کے گناہوں کے اعمال نامے پھاڑ کر مٹا دیے گئے ہوں گے لیکن لوگ سب یاد رکھیں گے ۔ ان کے نام بھی، ان کے گناہ بھی ۔ انہیں معاف کر کے اللہ تو انہیں عزت اور رتبہ دے دینے والا ہے لیکن مخلوق کے دل کا میل دھلنے والا نہیں ہے ۔ انسان...... اس کا دل رائی کے دانے سے چھوٹا ہے، اور یہ انسان اپنا دل بڑا کرنے والا نہیں ہے ۔

''ہمارا حسب نسب اور ہمارا ماضی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔'' چکی پیستے ہوئے جنت زیر لب بڑبڑائی تھی ۔ درویش کی بیوی کم گو تھی لیکن اس نے تسلی بخش نظر جنت کی طرف اٹھائی تھی ۔

''تم نے تو شکایتیں کرنی شروع کر دی ہیں ۔'' اس نے نرمی سے کہا۔

''کیا امیر الحج نے اس لیے انکار کر دیا کہ ہم...... ہم......'' آمنہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھی ۔

''آگے کچھ نہ کہنا آمنہ! میرے دل کو تکلیف نہ دو ۔ میں ایسی زمین پر آباد ہوں جہاں حق کی روشنی تو پہنچی ہے لیکن اس روشنی پر ابھی تک اندھیرے غالب ہیں ۔ آج بھی لوگوں کی وہی سوچ ہے جو اسلام آنے سے پہلے تھی ۔ جن باتوں کو جاہلیت قرار دیا گیا، ان کے نام بدل کر لوگوں نے انہیں ''قاعدے قانون'' کا نام دے دیا ۔ حق تو آ گیا لیکن دلوں کا باطل نہیں مٹا۔''

آمنہ خاموشی سے اُٹھ گئی ۔ نہ اٹھتی تو پتا نہیں کتنے اور سوال پوچھ لیتی ۔ وہ شوخ و چنچل تھی ۔ پیچھے جو کچھ چھوڑا، آگے اس سے بڑھ کر پا لیا ۔ کھردری زمین پر پیال پر سوتے ہوئے، اس نے اپنی ہنسی کو کند نہیں ہونے دیا تھا ۔ لیکن اب اسے لگا کہ وہ کبھی مسکرا نہیں سکے گی ۔ وہ کبھی اس حقیقت کو بھول نہیں پائے گی کہ وہ کون ہیں اور کیا کرتی رہی ہیں......

''کیا ہمیں اپنے گناہ یاد رکھنے چاہیے یا اوقات؟'' جنت نے درویش کی بیوی سے پوچھا ۔ وہ وسوسوں کا شکار تھی ۔

''تمہیں صرف اللہ کی رحمت کو یاد رکھنا ہے، تمہیں تمہاری حیثیت خود بخود معلوم ہو جائے گی ۔''

رحمان کی رحمت کو یاد رکھنے کے لیے انہیں اپنی حیثیت بھولنی تھی۔عزیزہ خاموش تھی لیکن اندر ہی اندر غصے سے بل کھا رہی تھی۔وہ اپنا غصہ نکال دینا چاہتی تھی۔درویش نے لاکھ سمجھایا تھا کہ غصہ عقل کا دشمن ہوتا ہے لیکن وہ اس دشمن کو پال پوس کر بڑا کر دیا کرتی تھی۔عقل ویسے بھی ہر وقت استعمال میں نہیں لائی جا سکتی تھی۔وہ دل کی کمزور ہو سکتی تھی لیکن ارادوں کی مضبوط تھی۔سرباز اور درویش سے پہلی ملاقات کے بعد اس نے نیت کر لی تھی کہ وہ جلد سے جلد اپنی جگہ چھوڑ دے گی۔دو دن بعد وہ ان دونوں کو ساتھ لے کر درویش کے ساتھ سیدھے راستے کی طرف آ گئی تھی۔

راستہ جتنا سیدھا ہو اس پر چلنا اتنا ہی مشکل ہوتا ہے۔پتھر نہ ملیں تو کنکر ملتے ہیں۔حق پر چلنے والوں کو اعزاز نہ ملے تو دھتکار ملتی ہے۔تائب ہونا آسان تھا، ہر وہ کام جو بندے اور اللہ کے درمیان ہوتا ہے، آسان ہوتا ہے۔وہ آسانیاں دیتا ہے۔فرض دیتا ہے تو قضا بھی رکھتا ہے۔گناہ کے بعد توبہ کی شفاء بھی دیتا ہے...... یہ وصف انسانوں نے نہیں اپنایا۔

تینوں کے لیے وہ رات کانٹوں کا بستر تھی۔جس دن درویش انہیں ملا تھا، انہیں ہدایت مل گئی تھی۔جس دن محمل شریف پر ان کی نظر پڑی تھی، انہیں راستہ مل گیا تھا۔جس لمحے حج کی نیت کی، اسی لمحے بندگی کی منزل دکھائی دی......

سفر زندگی کا ہو یا بندگی کا...... ارادے کی مضبوطی شرط ہے......

یہ حقیقت جان لینے کے بعد کہ وہ کبھی بھی حج کے لیے نہیں جا سکیں گی ان کے دل گہری اداسی میں گھر گئے تھے۔کوئی امیر الحج انہیں کاروان میں قبول نہیں کرے گا۔کوئی انہیں خوش آمدید نہیں کہے گا۔سب انہیں ملامت کریں گے کہ وہ کسوۃ الکعبہ کے ساتھ سفر کرنے کی جرات بھی کیسے کر سکتی ہیں۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

عزیزہ نے ایک جرات کی تھی...... وہ میدان کاروان میں امیر الحج کو ڈھونڈنے لگی تھی......

میدان کاروان میں مصر اور قریب و جوار کی ریاستوں سے قافلے آ چکے تھے۔چند قافلے رہ گئے تھے جو اگلے دن تک پہنچ جانے والے تھے۔شہر کے مہمان خانے، شاہی سرائیں، میدان، حاجیوں سے آباد ہو چکے تھے۔

میدان میں ہر طرف خیمے ہی خیمے تھے۔ قاہرہ کے لوگ حاجیوں سے ملنے کے لیے میدانِ کاروان آتے تھے۔ عزیزہ بھی آمنہ اور جنت کے ساتھ آئی تھی۔ درویش کی بیوی اپنے ساتھ کھانے پینے کی کچھ ایسی زبردست چیزیں لائی تھی جو سفر کی تکان کو زائل کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ وہ چند عورتوں کو بہت عاجزی سے وہ چیزیں پیش کر رہی تھیں۔ عزیزہ نے امیر الحج کو انتظامات میں مشغول دیکھ لیا تھا۔ وہ منہ بنائے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ وہ ضدی، بدتمیز اور منہ پھٹ مشہور تھی لیکن درویش کے کہنے پر اس نے ان بیماریوں سے جان چھڑوالی تھی لیکن ایک بیماری ابھی تک اسے چمٹی ہوئی تھی...... وہ تھی بھڑک اٹھنے کی بیماری...... چنگاری کے آگ بن جانے کی بیماری...... اس کا دل چاہا کہ امیر کاروان کے پاس جائے اور کھری کھری سنا دے۔

وہ ایسا تو نہیں کر سکی لیکن ایک معمولی سا پتھر اٹھا کر اسے غیر معمولی انداز سے مارے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ امیر کاروان بھی جلالی انداز سے پلٹے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ توپ کے گولے تباہ و برباد کر دیتے ہیں، وہ لوگ نوکیلے پتھر کمر پر کھا کر دیکھیں...... تباہ و برباد نہ ہی، خانہ برباد یہ بھی کر دیتے ہیں۔

پیچھے عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے سب موجود تھے۔ جس طرف نظر اٹھتی تھی انسان ہی انسان دکھائی دے رہے تھے۔ ہاں ایک لڑکی چادر میں منہ چھپا رہی تھی، اور ایسا کرتے ہوئے صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ لمبے لمبے ڈاگ بھرتا ہوا اس کے قریب آیا۔ اس نے بھی بھاگنے کی کوشش نہیں کی تھی...... گولہ مار کر توپ، زمین پر جم کر کھڑی رہی تھی......

''تم نے مجھے پتھر کیوں مارا......؟''

وہ حیران ہوئی تھی، پریشان بھی ہوئی تھی، گھبرا بھی گئی تھی لیکن، ''آپ سے کس نے کہا کہ میں نے مارا ہے؟'' سوال کو گھمانا نہیں بھولی تھی۔

''میں امیر کاروان ہوں، صحرا کی ہوا اپنا رخ بعد میں بدلتی ہے میں اس کی سمت پہلے پکڑ لیتا ہوں۔''

''ہونہہ! صحرا اور ہوا کے کچھ لگتے۔ ہاں مارا ہے...... موقعہ ملا تو اور ماروں گی۔ کوئی جن مل گیا تو اہرام اٹھوا کر دے ماروں گی۔ جنوں کی فوج مل گئی تو ساری دنیا کے پہاڑ اٹھا کر دے ماروں گی......''

لڑکی غصے میں تھی، لیکن اس کی باتیں...... ''میں نے کیا کیا ہے؟'' وہ ہنسنا چاہتا تھا لیکن سنجیدہ صورت پوچھ

رہا تھا۔

''تم امیر اچھے ہو لیکن دل کے سیاہ ہو.......''

مصر کی شان، قاہرہ کا ہر دل عزیز امیر کاروان، لوگ رک کر اسے سلام کرتے تھے، احترام دیتے تھے، یہ لڑکی اسے دل کا سیاہ کہہ رہی تھی۔ ''کون ہو تم ؟ کاروان میں شامل ہو؟''

''ہاں، لیکن تمہارے کاروان میں نہیں...... زندگی کے کاروان میں، جس کا امیر ''رب العالمین'' ہے۔''

وہ لاجواب ہوا تھا لیکن لڑکی کے غصے کی وجہ نہیں سمجھ سکا تھا۔ وہ جا چکی تھی۔ اس کی کمر سلگ رہی تھی۔ اس جیسے پہاڑ انسان کے لیے معمولی سا کنکر آگ کا گولہ تو نہیں تھا لیکن پشت جل رہی تھی۔

وہ گھر آیا تو بچے کاروان کاروان کھیل رہے تھے۔ وہ حج پر جانے والوں کے لیے قرعے نکال رہے تھے۔ یہ اس کے خالہ زاد بھائی کے بچے تھے۔ اس کا ان سے بہت پیار تھا۔ خاص طور پر احمد سے۔ ٹھنڈے پانی کا پیالہ منہ سے لگا کر نشست پر بیٹھ کر وہ دلچسپی سے انہیں دیکھنے لگا تھا۔

اب وہ جانوروں اور اناج کی باتیں کر رہے تھے۔ راستہ دکھانے والے آسمان کے ستاروں اور ریت کے طوفان کی۔ انہیں دیکھ دیکھ کر وہ ہنستا رہا۔ وہ اس کی نقل اتار رہے تھے۔ جب کاروان کی روانگی کا وقت آیا تو کھیل میں شامل سب بچے اپنا اپنا سامان اٹھا کر اپنے فرضی جانوروں پر سوار ہو گئے......اور مٹی میں کھیلتا چھ سالہ احمد، ایک دم سے مچل کر ان کی طرف لپکا۔ وہ عام بچوں جیسا نہیں تھا، اسے دماغی مسئلہ تھا۔ اس کی زبان میں لکنت بھی تھی۔ ابن موسیٰ نے لپک کر احمد کو اپنی گود میں اٹھا لیا۔ لیکن وہ مچل رہا تھا، رو رہا تھا، سب بچوں کو گالیاں دے رہا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ ابن موسیٰ نے جلدی جلدی اس کا سامان تیار کیا اور اسے فرضی جانور پر سوار کر کے کاروان میں شامل کرنا چاہا تو امیر کاروان دانیال چلا اٹھا۔

''یہ ہمارے ساتھ نہیں جائے گا چچا......''

''لیکن کیوں...... بھائی کو پیچھے چھوڑ کر جا رہے ہو، بری بات ہوتی ہے۔''

''کیونکہ یہ روتا اور چلاتا ہے...... یہ گالیاں دیتا ہے...... یہ برا انسان ہے......''

''یہ برا انسان نہیں ہے۔ اسے اچھے اور برے کی سمجھ نہیں ہے، جلد ہی یہ سمجھدار ہو جائے گا......'' اس نے

تحمل سے سمجھانا چاہا۔

''جسے اچھے برے کی سمجھ نہیں ہے، اس پر حج بھی فرض نہیں ہے۔''

اس کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔ ''حج ہر صاحب حیثیت مسلمان پر فرض ہے میرے بیٹے! بیمار یا تندرست پر نہیں۔''

''یہ بیمار ہے، یہ اتنا لمبا سفر نہیں کر سکتا۔''

''یہ بیمار نہیں ہے...... تمہارے بھائی کا دماغ اس کا ساتھ نہیں دیتا۔''

''جس کا دماغ ساتھ نہیں دیتا، اسے ہم ساتھ نہیں رکھ سکتے۔ ایسے انسان کا اللہ کے گھر میں کیا کام، جو ہر انسان کو برا بھلا کہے، اسے گالیاں دے۔ کیا بری زبان والے اللہ کا گھر دیکھنے کے حق دار ہیں؟''

''دوسروں کے حق پر لکیر کھینچنے والے تم کون ہوتے ہو۔ یہ نہیں جانتا یہ کیا کہہ رہا ہے۔'' بچوں کی تنگ دلی پر وہ ہکا بکا رہ گیا تھا۔

''جب یہ نہیں جانتا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے تو پھر وہ کیسے کہے گا جو اسے کہنا چاہیے۔ جو حاجی طواف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔''

''انسان اپنی حاضری کی گواہی زبان سے نہیں روح سے دیتا ہے میری جان......''

''روح کیا ہوتی ہے چچا جان؟ ہم تو اس کی زبان کو جانتے ہیں جو گندی ہے، لکنت زدہ ہے۔ اس کا جسم بد بودار ہے۔ یہ ناپاک ہے۔ یہ اللہ کے پاک گھر میں کیسے جا سکتا ہے۔ صرف اس لیے کہ امیر کاروان اس کا بھائی ہے۔ نہیں...... میں یہ ناانصافی نہیں کروں گا۔''

''گندی، بد بودار، ناپاک......'' ابن موسیٰ زیر لب بڑبڑایا۔ بچوں کا کاروان اپنے فرضی جانوروں پر آگے بڑھ گیا تھا۔ پیچھے دھاڑے مار مار کر احمد رونے لگا تھا۔ وہ اس کی گود سے پھسل گیا اور زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ اس کے رونے کی آواز، اس کے درد کی شدت...... اس نے آگے چلے جانے والوں کو اور پیچھے رہ جانے والے کو دیکھا۔

جو پیچھے رہ جاتے ہیں...... دراصل وہی آگے والوں سے آگے نکل جاتے ہیں......

احمد کے آنسوؤں سے تر گالوں نے اس کا دل دو ٹکڑے کر ڈالا تھا۔ وہ بار بار ہاتھ اٹھا کر کاروان والوں کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ کاروان کے امیر نے جھک کر احمد کو اٹھایا، اپنے سینے سے لگایا اور قاہرہ کی گلیوں سے گزرتے ہوئے خود کو کہتے پایا۔

''ایک اللہ کے لیے...... ایک اللہ والا لے جاؤ......''

نیت، عمل اور ارادے غلط ہو سکتے ہیں لیکن تڑپ ہمیشہ سچی ہوتی ہے۔ تڑپے بغیر کوئی نہیں روتا، بے چین ہوئے بغیر کوئی طلب نہیں کرتا۔ دعا ہو یا دوا، زخم ملے بغیر کوئی نہیں مانگتا۔ امیر کاروان نے قاہرہ کی پتھریلی زمین پر چلتے ہوئے خود سے کہا۔ احمد ابھی تک رو رہا تھا، مچل رہا تھا۔ اس کے غم کو چین نہیں تھا۔ اس کے دل کو سکون نہیں تھا۔

وہ درویش کے دروازے پر دستک دے رہا تھا......

''مجھے معاف کر دو درویش! میں ان تینوں کو کارواں میں شامل کرتا ہوں۔ تم ان سے کہو کہ وہ اپنی شناخت چھپا کر رکھیں۔ یہ بات ہم پانچ لوگوں کے درمیان رہنی چاہیے......''

دروازہ کھلتے ہی امیر الحج نے اپنی نم آنکھیں پونچھے بغیر کہنا شروع کر دیا تھا۔ سامنے درویش نہیں ''عزیزہ'' کھڑی تھی۔ وہ حیران امیر الحج کی صورت دیکھ رہی تھی۔ وہ شرمندہ تھی، خوش تھی، خوشی سے بے قابو ہو رہی تھی......

''کس چیز نے آپ کے ارادے کو بدل دیا؟'' وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

امیر الحج نے دیکھا کہ اسے پتھر مارنے والی سامنے کھڑی پوچھ رہی ہے۔ اس نے احمد کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''حق نے......''

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

ایک اللہ کے لیے تین اللہ والے......

منہ اندھیرے نکل کر انہوں نے خیموں میں سے ایک خیمے میں پناہ لے لی تھی۔ وہیں سے انہیں اونٹوں پر سوار ہو جانا تھا۔ ابن موسیٰ نے انہیں سختی سے کہا تھا کہ انہیں کسی سے بھی بات نہیں کرنی۔ اپنی شناخت چھپا کر رکھنی ہے۔ خود کو گونگا بنا لینا ہے۔ کوئی ان کی آواز تک سے انہیں پہچان نہ سکے۔ حج کے لیے کیا جانے والا سفر مشکل ہوتا

ہے، ان کے لیے کچھ زیادہ ہی مشکل ہونے والا تھا۔

احرام، دستی قرآن پاک، جائے نماز اور کچھ ضروری سامان...... یہی تو ہے اصل سامان...... سفر حج اور سفر حیات، دونوں کے لیے۔ پھر اس سے زیادہ کیا جمع کرنا۔ اس سے زیادہ کی چاہت کیوں کرنی۔

درویش نے انہیں نم آنکھوں کے ساتھ الوداع کیا تھا۔

''جس دن تم نے تائب ہونے کا فیصلہ کیا تھا، وہ دن میرے زندگی کا خوب صورت دن تھا۔ اس دن میرا یقین اور پختہ ہو گیا تھا کہ ہدایت نصیب والوں کو نہیں، توفیق والوں کو ملتی ہے۔ اللہ کسی کے دل میں رائی برابر بھی ایمان دیکھتا ہے تو اسے پوری ہدایت عطا کر دیتا ہے۔ اور یہ اس تک ہی آتی ہے جسے یہ حاصل ہونی ہو۔ جسے پیام مل گیا وہ جاہل نہیں رہا، جسے سیدھا راستہ دکھا دیا گیا، اس نے سب کچھ پا لیا۔ دین صرف کلمہ نہیں اور حج زیارت نہیں...... نماز جسم کی حرکات نہیں اور قرآن لفظوں کا پلندہ نہیں...... جو توبہ کرے، تائب ہو جائے، اس پر دین کا بار زیادہ آ جاتا ہے۔ جیسے عالم پر علم کا ذمہ ہوتا، جاہل تو بری الذمہ ہو جاتا ہے۔ جو توبہ باف ہوں وہ ایمان سے بری الذمہ نہیں ہونے چاہیے۔

جو عہد کیے ہیں ان پر قائم رہنا۔ ایمان حاصل کرنا آسان ہے، اسے قائم رکھنا مشکل ہے۔ مومن بال سے باریک، تلوار سے تیز صراط (راستے) پر چلتا ہے۔ دیکھو، تمہاری طرف شیطان نے اپنا نشانہ باندھ لیا ہے، ان نشانوں کو خطاء کرنا، لیکن خود خطا کار نہ ہو جانا۔ دین حق کا نام ہے، حق کو قائم رکھنے کا نام ہے۔ نماز پڑھنا آسان ہے، اسے قائم رکھنا مشکل ہے، حج کے لیے کمربستہ ہونا آسان ہے...... اس حج کو ''پا'' لینا مشکل ہے۔ احرام سفید ہوتا ہے کیونکہ یہ اعمال کی سیاہی کو سمیٹ لیتا ہے، چھپا لیتا ہے......

سفید...... جس سے نکل کر ہر رنگ بنتا ہے...... لیکن یہ کسی رنگ سے نکل کر نہیں بنتا۔ یہ خالص ہے اور یکتا بھی۔ تمہارے لیے اللہ نے یکتا رنگ کو پسند کیا اور بہترین رنگ تو اللہ کا ہی رنگ ہے۔ اسے اپنا لو گی تو پھر پیچھے رہ بھی جاؤ گی تو بہت آگے نکل جاؤ گی۔''

درویش نے کہا۔ انہوں نے سنا۔ انہوں نے یاد کر لیا۔ تینوں درویش کی احسان مند تھیں۔ درویش کی بیوی انہیں گلے سے لگا رہی تھی۔ انہیں رخصت کرنے والے بس یہ دو ہی لوگ تھے۔ کاروان کو رخصت کرنے مصر کا ہر

خاص و عام آیا تھا۔مسجد کے امام نے حاجیوں کے لیے اجتماعی دعا کروائی تھی۔حج اور سفر حج کی فضیلت بیان کی گئی تھی۔

جس وقت اونٹوں نے اپنے گھٹنے کھڑے کیے،اور حاجیوں کو رخصت کرنے والے ہجوم نے اللہ اکبر کے نعرے بلند کیے تو عزیزہ سے اپنی خوشی سنبھالنا مشکل ہوگئی تھی۔اس نے اپنے پیچھے بیٹھی آمنہ کو دیکھا۔دائیں طرف جنت کا اونٹ تھا،وہ ایک خاتون کے ساتھ بیٹھی تھی۔ان تینوں نے درویش کو ہجوم میں ڈھونڈنا چاہا لیکن درویش کی بیوی تو دکھائی دیں لیکن درویش کہیں نظر نہیں آئے۔

انہوں نے اونٹ کی سواری بہت بار کی تھی،وہ گھڑ گاڑیوں میں بھی بیٹھی تھیں،انہوں نے مصر کی بلند عمارتوں پر بیٹھ کر چاندنی راتوں میں کھانے بھی کھائے تھے۔اعلی عہدے داروں کو اپنے سامنے گھٹنوں کے بل جھکتے ہوئے پایا تھا لیکن انہیں کبھی اپنا آپ اتنا بلند نہیں لگا تھا جتنا اس ایک اونٹ پر بیٹھ کر لگ رہا تھا۔

قاہرہ کے لوگوں کا ہجوم،حج پر جانے والوں کے عزیزوں کی پر جوش آوازیں۔بچیوں کا دف بجانا،ہاتھ بلند کر کے انہیں سفر بخیر کی دعائیں دینا اور اپنا نام لے لے کر دعاؤں کے لیے کہنا......جب انسان اللہ کے راستے پر آجاتا ہے تو وہ کتنا معتبر ہو جاتا ہے۔بلندی نصیب ہوتی ہے اور پستی مٹ جاتی ہے۔

کاروان نے اپنا سفر شروع کیا۔یہ وہ ہی مصر تھا جہاں سے فرعون اپنا لشکر لے کر حق کو نیست و نابود کرنے نکلا تھا۔یہ وہ ہی مصر تھا جہاں سے غلاف کعبہ،کلام پاک اور حاجیوں کا سب سے بڑا کاروان نکل رہا تھا......

وقت بدلتا ہے،حق آتا ہے اور باطل مٹ جاتا ہے۔

عزیزہ نے وہ نام یاد کر لیے تھے جو چند بوڑھی عورتوں نے چلا چلا کر لیے تھے۔وہ جانے والوں سے اپنے لیے شفاء کی دعائیں کروانا چاہتی تھیں۔جنت کے دل پر عجیب سی ہیبت طاری تھی۔دس ہزار حاجیوں کا کاروان،زمین کے ہر کونے سے نکل کر،زمین کے ایک گھر کی طرف جانے والے حجاج کرام۔وہ مبہوت بھی تھی اور مشکور بھی......آمنہ نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔

سب کچھ پیچھے رہ جاتا ہے......ایک بندہ اور اس بندے کا "رب" رہ جاتا ہے......

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

کھلا صحرا، ستاروں بھرا آسمان، اونٹوں اور گھوڑوں کے چلنے کی آواز، مشعلوں کی روشنی......

اور تسبیح کائنات......تسبیح زمین و مکاں......

ان تینوں کی سواریاں پیچھے تھیں۔ دُور آگے تک ایک لمبی لکیر تھی جو دکھائی دیتی تھی۔ صحرا کی صوفیانہ خاموشی اور کارواں کی درویشانہ چال......عزیزہ کا معصوم دل، اس منظر پر آفریں تھا۔ وہ اس جلالی منظر کے قیام و طعام پر اپنے دل کو خوشی سے مکمل پاتی تھی۔ زمین و آسمان سے سمٹ کر ہر ذی روح سفر کمال کو جا رہی ہے۔ جو کل حاصل نہیں تھا وہ آج حاصل کرنے جا رہی ہے......

سفر رب......یہ پیدائش سے موت تک کا سفر ہے......

سفر رضا......یہ ایک عمل سے دوسرے عمل کا سفر ہے......

تینوں سر اٹھا کر آسمان دیکھ رہی تھیں۔ انہیں یہ توفیق اب حاصل ہوئی تھی کہ وہ جان سکیں کہ زمین و مکاں دراصل ہیں کیا۔ آسمان کا تھال، چراغوں کا مکاں، یہ دراصل کس کی عظمت کو بیان کرتا ہے۔ صحرا کی وسعت، صحرا کی گرمی، سختی اور نرمی، اس کی استادی، اس کی چالاکی، اور چالبازی......اس کا دلار، اس کی مہربانی اور اس کی بزرگی، زندگی کی نمائندہ ہے۔ پیامبر بدل جاتے ہیں لیکن پیغام ایک ہی رہتا ہے......بندے سے پہلے "رب" کہتا ہے، میں حاضر ہوں میرے بندے، ہر جگہ، ہر ساعت، ہر دعا، ہر مقام......ہر روح......ہر شے میری مظہر ہے......ہر شہادت میری گواہ ہے۔ ہر تعریف مجھ سے شروع، مجھ پر ختم ہے۔

یہ سفر کا بیسواں دن تھا۔ یہ گرم موسم کے دن تھے۔ کبھی موسم معتدل ہو جاتا تھا تو ان کا سفر تیز اور آرام دہ ہو جاتا تھا۔ وہ دن میں پڑاؤ کرتے اور دن ڈھلتے ہی سفر شروع کر دیتے تھے۔ ایسے سفر کے لیے صاحب حیثیت ہونے کے ساتھ صاحب ہمت ہونا بھی بہت ضروری تھا۔ سفر لمبے ہی ہوتے ہیں لیکن جو سفر کٹھن اور سخت بھی ہوں وہ جہاد ہوتے ہیں۔

"جس انسان نے اللہ کی عظمت کی معمولی سی جھلک دیکھنی ہو، وہ صحرا کی وسعت میں آسمان کی وسعت دیکھے، رات میں دیکھے اور ستاروں کی قربت میں دیکھے......" عزیزہ نے سر کو آمنہ کی سمت جھکا کر کہا۔

"اور کیا کرے؟" آمنہ نے سر پیچھے اس کی سمت گھما کر پوچھا۔

"اور پھر وہ کائنات کی آواز سنے...... سنے کہ کائنات کیسے تسبیح بیان کرتی ہے......" وہ اپنے کان، کائنات کی تسبیح پر مرتکز رکھنا چاہتی تھی۔

"کائنات کیسے تسبیح کرتی ہے عزیزہ؟"

"الحمد اللہ رب العالمین...... رب العالمین...... رب العالمین......"

رب العالمین کے جہاں میں...... قلعے نما چاردیواری تھی...... کاروان سرائے...... حاجیوں کے عارضی قیام کے لیے خلیفہ نے بنوائی تھی۔ ایک کنواں تھا، چھوٹی سی مسجد تھی۔ بیٹھنے، اونگھنے، آرام کرنے کے لیے کچھ سایہ دار مقام بنے تھے۔ یہاں پرندوں کے غول کے غول اتر رہے تھے۔ قافلوں اور کاروانوں کے نشان زمین پر دیکھے جا سکتے تھے۔ عارضی چولہے اور کچھ استعمال کی چیزیں۔ دیواروں میں ہاتھ برابر کھوہ میں کچھ برتن رکھے تھے۔ آگے نکل جانے والے، پیچھے آنے والوں کو اپنی کچھ نشانیاں دے رہے تھے۔ آب خورے، عطر کی چھوٹی کپیاں، کپڑے کی پوٹلی میں بندھے اپنی سرزمینوں کے کچھ معمولی زیور، کچھ تسبیحات اور ہاتھ کی کڑھائی سے سجے حجاب۔

عزیزہ کے ہاتھ میں کپڑے کی پوٹلی آئی تھی۔ وہ اتنی خوش تھی جیسے اسے دنیا جہاں کا خزانہ مل گیا ہو۔ کسی قافلے یا کاروان کی عورت نے، اجنبی سرزمین کی اجنبی لیکن دوست عورت کے لیے ایک تحفہ رکھا تھا۔ اس نے محبت کا ایک پیغام دیا تھا۔ دوستی کا معمولی لیکن گہرا اشارہ......

عزیزہ نے محبت کا پیغام پا لیا تھا، دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا تھا۔ وہ کان کے زیور آنکھوں کے سامنے لا کر دیکھ رہی تھی۔

"یہ تم اپنے نکاح پر پہن لینا" بے ساختہ جنت کے منہ سے نکلا تھا۔

"پتا نہیں کس نیک بخت خاتون کے زیور ہیں، اس کی نیک بختی کا سایہ تم پر بھی پڑ جائے گا" آمنہ عزیزہ کے لیے خوش تھی۔

عزیزہ بھی بدلے میں کھوہ میں کچھ رکھنا چاہتی تھی لیکن اس کے پاس کوئی زیور نہیں تھا۔ خرچ کے لیے ان کے پاس سکے تھے۔ یہ ان کی محنت کی کمائی تھی۔ درویش نے کہا تھا سفر میں، سفر خرچ کی ضرورت پڑتی رہتی ہے، وہ یہ سکے سنبھال کر رکھیں۔ اس نے کچھ دیر سوچا اور پھر تین سکے نکال کر کھوہ میں رکھ دیے تھے۔ جو دینا چاہتے ہیں وہ

بھوکے رہ کر بھی دے دیتے ہیں۔سخاوت سونے کے پہاڑ دینے کا نام نہیں،سخاوت اپنی بھوک رکھ کر،کسی دوسرے کی بھوک کی مٹا دینے کا نام ہے،ضرورت پوری کر دینے کا نام ہے۔وہ بھی اجنبیوں کو دوستی کا پیغام،ایک عدد تحفہ دینا چاہتی تھی......

آمنہ کے ہاتھ کپڑے کے پرچے پر لکھا ایک خط آیا تھا۔زبان فارسی تھی،وہ پڑھنے سے قاصر تھی،کاروان میں کچھ لوگ یقیناً فارسی پڑھ سکتے ہوں گے لیکن وہ کسی کے پاس نہیں جانا چاہتی تھیں۔درویش نے منع کیا تھا کہ وہ کسی بات نہ کریں۔خط کو اس نے سنبھال کر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔جنت کے ہاتھ میں ایک تسبیح آئی تھی۔یہ لکڑی کے دانوں کی تسبیح تھی۔وہ تسبیح کی خوبصورتی پر حیران تھی۔اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا باکمال تحفہ اسے مل سکتا ہے......وہ بھی ایسے صحرا میں اور ویرانے میں۔

''جو ہماری چیزیں ہوتی ہیں،وہ ہمیں ہی ملتی ہیں۔ان کی حفاظت فرشتے ہمارے لیے کرتے ہیں۔''عزیزہ نے مسکرا کر کہا۔

آمنہ اور جنت نے ناسمجھی سے عزیزہ کو دیکھا۔''کیا واقعی میں؟''

''ہاں......یہی دیکھ لو کہ اتنے بڑے کاروان میں یہ سب چیزیں ہمیں ہی نصیب ہوئی ہیں۔یہ ہماری ہی تھیں،ہر صورت ہمیں ہی ملنی تھیں۔انسان کو اللہ کی رحمت پر یقین ہونا چاہیے۔اللہ اپنے بندوں کو تحائف دینا جانتا ہے اور وہ ان کے نصیب کی چیزوں کو حفاظت میں رکھتا ہے۔''

سورج سر پر تھا،دن بہت گرم تھا۔کنوئیں کے پانی سے منہ پر چھینٹے مارتے،کارواں والوں کی آوازوں کا شور سنتے،گرم لو کے تھپڑے سہتے وہ مر جانے کی حد تک خوش تھیں۔درویش نے بالکل ٹھیک کہا تھا،وہ اصل کے مقابلے میں گھاٹے کا سودا کر رہی ہیں۔اگر وہ پلٹ کر اصل کی طرف نہیں آئیں تو بہت نقصان میں رہیں گی۔توفیق کی رحمت نے انہیں گھاٹے کے سودے سے بچا لیا تھا۔وہ نماز ظہر کے لیے اپنی جائے نماز بچھا رہی تھیں۔

ادھر ادھر کاروان کھانے پینے،ستانے میں مصروف تھا۔اونٹ بان اونٹوں کو پانی پلا رہے تھے۔گھوڑوں کی تھوڑی ناز برداریاں کی جا رہی تھیں۔اونٹ جتنا اللہ لوک جانور ہے،گھوڑا اتنا ہی شوخا اور لاڈلا۔پاؤں پاؤں

چلنے والا بچہ بھی اونٹ کی بان پکڑ کر اسے کہیں بھی لے جا سکتا ہے۔ درویشی اور عاجزی اونٹ کی روح پر اتنی غالب آ چکی ہے کہ پیدا ہوتے ہی اس کے چہرے سے ''بزرگی'' جھلکنے لگتی ہے۔ جانوروں میں ایسی بزرگ صورت صرف اونٹ کو ہی نصیب ہے۔

''کیا یہ لوگ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ انہیں کیسے پیدا کیا گیا'' (القرآن)۔

کلام پاک میں مالک دو جہاں نے ان کا ذکر، آسمانوں، پہاڑ، زمین سے پہلے کیا ہے۔ یہ نمازی کی طرح جھکتا اور ایمان والوں کی طرح کھڑا ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ نبیوں کی سواری رہا ہے۔

عزیزہ کا ستانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ گھوم پھر کر کاروان دیکھ رہی تھی۔ اس نے چہرے پر نقاب کھینچا ہوا تھا۔ وہ کاروان کے لوگوں کو دیکھنا چاہتی تھی۔ جو اس کے ہم سفر تھے۔ جو اس پڑاؤ میں اس کے ہم نشین تھے۔ اس کے لیے یہ کاروان ایک پورا جہاں تھا۔ وہ ساری دنیا نہیں گھوم سکتی تھی۔ لیکن وہ ساری دنیا سے اکھٹے ہوئے ''جہاں'' کو دیکھنا چاہتی تھی۔

ایک خاتون ٹھہر ٹھہر کر کلام پاک پڑھ رہی تھیں۔ وہ پڑھتی جاتیں، روتی جاتیں۔ پتا نہیں وہ رب کی عظمت پر آبدیدہ تھیں یا اس کی محبت پر۔ کچھ دور ایک اونٹ بان سر کے نیچے بازو رکھے سو رہا تھا، اس کے دن کے خراٹے، رات کے جھینگروں کو مات دے رہے تھے۔ اس کا اونٹ، اس کے سر پر جھکا اس سے لاڈ کر رہا تھا۔ اپنا منہ اس کے منہ کے قریب لا کر اس کے منہ پر کھیل تماشہ کرتی مکھیوں کے کھیل برباد کر رہا تھا۔ عزیزہ ہنس دی۔

''کیسی بے فکری نیند ہے اس کی۔ جی چاہتا ہے اس کے سر کے نیچے سے اس کا تکیہ، اس کا بازو کھینچ دوں۔''

''میرا خیال ہے کہ مجھے کچھ کنکریاں اکھٹی کر کے تمہیں دے مارنی چاہیے۔ تمہارے اندر کا شیطان ابھی بھی زندہ ہے۔'' آمنہ نے اس کا باوز پکڑ کر کھینچ کر آگے کیا کہ وہ اس بے چارے معصوم کو معصومانہ نیند سو لینے دے۔

ادھر ادھر، یہاں وہاں کتنے ہی لوگ ٹولیاں بنا کر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ عزیزہ نے ذرا غور کیا تو اسے محسوس ہوا کہ ان میں سے بہت سے لوگ ایک دوسرے کی زبان ٹھیک سے سمجھ نہیں رہے۔ لیکن وہ باتیں ایسے کر رہے تھے جیسے زبان اور کلام کوئی مسئلہ ہی نہ ہو۔ انہیں سب سمجھ میں آ رہا ہے..... انہیں سب معلوم ہو رہا ہے..... ہاتھ لہرا لہرا کر، جوش سے اشارے کرتے ہوئے، شاید وہ اپنی اپنی سر زمینوں کے قصے کہانیاں سنا رہے

تھے۔عزیزہ کو شوق ہوا کہ کوئی قصہ اسے بھی سنائی دے جائے لیکن اس کے لیے اسے ان کے قریب جا کر بیٹھنا تھا۔جو وہ کر نہیں سکتی تھی۔ جنت نے اسے صاف صاف دھمکی دے دی تھی کہ اگر اس نے یہ حرکت کی تو وہ واپسی پر درویش سے اس کی شکایت کر دے گی۔

''کچھ کنکریاں تمہیں بھی پڑ جانی چاہیے۔تمہارے اندر کا چغل خور شیطان بھی ابھی تک زندہ ہے۔''عزیزہ کا منہ بن گیا تھا۔

چغل خور شیطان گردن کو خم دے کر آگے بڑھ گیا۔دیوار کے سائے میں بیس بائیس عورتیں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔کچھ شوہر کی،کچھ بچوں کی،باقی ساس کی......ان کی باتیں لاجواب تھیں۔تینوں ان کے ساتھ جا کر بیٹھ گئیں اور چغلیاں سننے لگیں۔

''دیکھو لو نکاح ایسا جان کا عذاب ہے......'' آمنہ نے جنت کے کان میں سرگوشی کی۔

''میرا خیال ہے کہ اصل عذاب صرف ''ساس'' ہے۔''جنت کو بڑا مزا آ رہا تھا۔

''عورتوں کے شکوے کبھی ختم نہیں ہوتے،وہ صحرا کے سفر پر کاروان کے ساتھ ہی کیوں نہ ہوں،انہیں اپنا پیچھا نہیں بھولتا۔شوہر،بچے اور راز جان ساس......''

دنیا میں کوئی عورت اتنی بدنام نہیں جتنی ''ساس'' ...... ہے نا عزیزہ؟''

''مجھے کیا پتا،میں نے کون سا کسی بدنام زمانہ ساس کو بھگتا ہے......''

''اچھا چلو فرض کرتے ہیں کہ تمہاری ایک عدد ساس ہے......تمہاری جان کا عذاب ہے تو تم کیا کرو گی......''

''کیا مطلب کیا کروں گی......خدمت کروں گی،ساس کا دل بدلنے کی کوشش کروں گی،پھر بھی وہ نہ بدلیں تو پھر ان کے ''دن'' اور ''جون'' دونوں بدل دوں گی......عزیزہ نام ہے میرا،ساس نامی معرکہ سر کر کے ہی رہوں گی۔''

تینوں نے قہقہہ لگایا لیکن دو تین عورتوں کے کانوں میں عزیزہ کے نیک ارادوں کی بھنک پڑ چکی تھی،وہ سر گھما کر اسے گھور کر دیکھ رہی تھیں۔وہ اس بدتمیز لڑکی کی شکل یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھیں تا کہ بھول کر بھی وہ

اسے اپنی بہو نہ بنالیں۔

بھول جانے والی ساری باتیں بھلا کر، وہ نئے سبق یاد کر رہی تھیں۔ صحرا کی کہانیاں سن رہی تھیں۔ عزیزہ ایک ٹیلے پر جا کر کھڑی ہوگئی تھی۔ آمنہ اور جنت بھی قریبی ٹیلوں پر کھڑی ہو چکی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ بے آباد صحرا کو انسانوں نے آکر آباد کر دیا ہے۔ یہ صحرا جو اپنی جان میں پورا تھا لیکن ادھورا تھا، اسے انسان نے آکر مکمل کر دیا تھا۔ زمین اپنے اوپر اور اندر جتنی بھی خاصیتیں رکھتی ہے، پہاڑ، دریا، جانور، صحرا، چرند پرند، خزانے...... ان سب خاصیتوں کو انسان کی روح کی سانس لگتی ہے تو وہ بھی سانس لینے لگتی ہے۔ ہر شے کہیں نا کہیں جا کر "انسان" سے جا ملتی ہے۔ ہیرا اپنی خاصیت میں کتنا ہی باکمال کیوں نہ ہو...... شان میں بلند تر، خوبصورتی میں ارفع، انسان کا ہاتھ، سانس، آنکھ لگے بغیر پتھر ہے...... پتھر ہے...... صرف پتھر ہے...... جوہر کو جوہری ہی نصیب نہیں ہوگا تو پھر وہ "جوہر" بھی کیسے ہوگا......

"کیا دیکھ رہی ہو؟"

"اللہ کتنا بڑا ہے......"

"تو یہ تمہیں یہاں آکر معلوم ہوا ہے؟"

"میں نے قاہرہ کے محلوں سے صرف آسمان دیکھا تھا، قاہرہ سے دور یہ صحرا اور آسمان دونوں دیکھے تو مجھ پر آشکار ہوا کہ جس چیز کے کنارے نہ ہوں وہ بہت بڑی ہوتی۔ میں چھوٹی تھی تو میں نے سمندر کا سفر کیا تھا۔ اس سفر نے مجھ پر عجیب کیفیت طاری کر دی تھی۔ کشتی کے عرشے پر کھڑے ہو کر میں نے دیکھا تھا کہ پرندے دیوانہ وار سمندر کی وسعت پر پرواز کر رہے ہیں۔ صحرا اور سمندر، یہ پرندوں پر بھی ہیبت طاری کر دیتے ہیں۔ اور پھر یہ دیوانہ وار پرواز کرتے ہیں...... یہی ان کی تسبیح ہے...... یہی ان کی ثناء ہے...... انسان کو بھی ایسے ہی دیوانہ وار ثناء خواں ہونا چاہیے......"

"زمین کہیں تو ختم ہو ہی جاتی ہوگی عزیزہ!؟" آمنہ عزیزہ کے تدبر سے متاثر ہوئی تھی۔

"کائنات بھی کہیں ختم ہو ہی جاتی ہوگی...... لیکن یہ شروع کہاں سے ہوئی ہے...... اصل عظمت تو اس میں ہے۔"

''اب تم عالموں جیسی باتیں کر رہی ہو۔'' جنت نے چلا کر کہا کہ آواز اس تک چلی جائے۔

''کیا اسی لیے حج فرض ہے کہ ہر انسان زمین کا سفر اختیار کرے، کہ اس پر رب کائنات کی عظمت کی نشانیاں آشکار ہوں۔ وہ زمین پر چلے پھرے اور دیکھے...... دیکھے کہ اس کا رب ہر شے پر غالب ہے...... ہر روح اس کی نمائندہ ہے...... میں نے صحرا کی رات میں اپنی روح کی آواز سنی ہے۔ وہ کہتی ہے ایک سجدہ جسم کرتا ہے، ایک سجدہ روح کرتی ہے، انسان کو اپنے نفس کو اس روحانی سجدے پر مائل کرنا چاہیے۔ اسے ایسے جھک جانا چاہیے کہ منکری کو مٹا دینا چاہیے۔ میں نے صحرا کو بڑا فرنبردار پایا ہے اور مجھ اس سے بہت شرم آئی ہے۔ یہ تنہا ہے، جلتا ہے، تڑپتا ہے، لیکن یہ اپنی جگہ سے سرکتا نہیں ہے۔ یہ ہر حال میں فرنبردار ہے۔ اپنی پیاس کے لیے یہ بارش تک نہیں مانگتا...... نہ نخلستان نہ باغ و بہار...... یہ اپنے حال پر راضی ہے...... اپنی خواہشوں کی تڑپ کے لیے ہمیں صحرا سے سبق سیکھنا ہوگا...... ہمیں سیکھنا ہوگا کہ گرم ہوا، جھاڑیاں، کانٹے، سیراب، ریت کے طوفان اور نشان بدلتے صحرا کے راہنما...... اگر ان سب کے ساتھ صحرا قائم رہ سکتا ہے، تو انسان بھی رہ سکتا ہے......''

''تو کیا اسی لیے حاجیوں کو صحرا کے سپرد کیا جاتا ہے تاکہ وہ اس سے سیکھ کر آگے جائیں......'' جنت کو عزیزہ کی باتیں سمجھ میں آ گئی تھیں۔

''سفر میں ملنے والا ہر نشان اُستاد ہے، راہنما ہے...... زندگی بھی تو ایک سفر ہی ہے......''

ایک عورت انہیں دیکھ کر ان کے پاس آئی تھی۔ وہ انہیں کھجور کے حلوے کی خشک ڈلی دے رہی تھی۔

''یہ کھا لو، یہ جسم کو چست و توانا کر دیتی ہے۔''

عزیزہ نے پوری ڈلی فوراً ہڑپ کر لی۔ ''تھوڑی اور چستی توانائی ملے گی؟''

عورت نے ہنس کر اسے دو تین اور پکڑا دیں۔ ''تم تو ہوا ہو، تمہارا سستی سے کیا تعلق۔''

''بڑی بھوکی ہو ویسے تم...... اکیلی ہی تین کھا گئیں......'' عورت کے جانے کے بعد آمنہ نے منہ بنا کر کہا۔

عزیزہ نے قہقہہ لگایا۔ ذرا دور گزرتے ابن موسیٰ کے پاؤں چلتے چلتے تھم سے گئے۔ اس نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر اسے دیکھا۔ غیر محسوس اس کی کمر سلگ اٹھی تھی...... لیکن...... وہ زیر لب مسکرا بھی دیا تھا...... پتا نہیں کیوں اسے چچی کی بات یاد آئی تھی کہ اسے شادی کر لینی چاہیے۔

''لیکن تم جیسے اکھڑ مزاج انسان کے ساتھ کوئی لڑکی خوش نہیں رہ سکے گی۔'' چچی نے جل کر کہا تو اس نے گھور کر چچی کو دیکھا۔

''میں تو دعا کرتی ہوں کہ تمہیں کوئی ایسی لڑکی ملے جس کی ترچھی نظر تمہاری آدھی جان نکال دے......''

''اور جس کی برچھی نظر آپ کی پوری جان......'' اس نے جل کر کہا تھا۔

عزیزہ کی پشت پر پوری نظر ڈال کر، وہ آگے بڑھ گیا تھا۔لیکن انسان دیکھ پیچھے رہا ہو، اور قدم آگے بڑھا رہا ہو تو کہیں نہ کہیں الجھ کر گر ہی جاتا ہے، وہ بھی اونٹ کی منہال سے الجھ کر گر پڑا اور اونٹ بان جو ٹولیوں میں بیٹھے تھے، منہ کھول کر ہنسنے لگے تھے۔امیر الجح بھی گرتے ورتے ہیں، یہ دیکھ کر انہیں بہت خوشی ہوئی۔

''والد کہتے ہیں جس انسان کے قدم زمین پر اور نظر آسمان کی طرف ہو، وہ انسان دیوانہ ہوتا ہے۔آپ کی دیوانگی کی کیا وجہ ہو سکتی ہے امیر الجح؟''

''اپنے دانت اندر رکھو، ورنہ یہ دیوانہ انہیں باہر نکال دے گا۔'' امیر الجح واقعی میں دیوانہ تھا۔

''آپ تو غصے میں بھی ہیں......اکیلا انسان غصے کا تیز ہوتا ہے۔آپ نکاح کیوں نہیں کر لیتے۔''

امیر الجح ہکا بکا اونٹ بان کو دیکھ کر رہ گیا تھا۔کیا اب زبان خلق بھی اس کے نکاح کی ہی بات کرے گی۔

''کیا قاہرہ کا کوئی خاندان آپ کو اپنی فرزندگی میں لینے کے لیے تیار نہیں ہے؟'' اونٹ بان کا مذاق ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

''قاہرہ کے خاندان مجھے فرزندگی میں لیں یا نہ لیں، لیکن قاہرہ کے قید خانے تمہیں شرف ''قید'' میں لینا پسند کریں گے۔''

''او اچھا اچھا......لیکن کیا ہی اچھا ہو جو آپ حاجیوں سے کہہ دیں کہ وہ آپ کے لیے نکاح کی دعا کریں۔کیا پتا اللہ کے گھر میں ہی آپ کا نکاح ہو جائے......'' امام کعبہ کو خوشی ہو گی امیر الجح کا نکاح پڑھانے میں۔''

خوشی تو اسے بھی ہو گی لیکن......لیکن......

امیر الجح نے سر کو جھٹکا۔والدہ ہوتیں تو اور بات تھی، وہ کاروان کا امیر بن کر، اپنے پیچھے اپنی اولاد کو یتیم

کرنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ یہ اس کا خوف تھا۔ وہ ابھی تک اس خوف سے نہیں نکلا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اس کا بیٹا بھی اس کی واپسی کا انتظار کرے گا اور پھر قاہرہ کی خاک کو اپنے سر میں ڈالے گا۔ وہ بھی روتا جائے گا اور کہتا جائے گا۔ ''اب میں بھی چولہے کی راکھ اور زمین کی خاک سے بدتر ہوا...... بدتر ہوا......''

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

''صرف چھ مہینے میں ہم کہاں سے کہاں آ پہنچے ہیں۔ اسے کہتے ہیں رب کی شان۔'' جب سے سفر شروع ہوا تھا، جنت بہت خوش باش رہتی تھی۔ وہ ان دونوں سے اپنے جذبات کا اظہار کر رہی تھی۔

''رب کی شان کی نشانیاں اکٹھے کرنے ہی تو حاجی سفر حج اختیار کرتے ہیں۔''

عزیزہ زیر لب بولی۔ اس کا دل تدبر کی گہرائیوں میں ڈوب ابھر رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ہیرا اور پتھر وزن میں ہم برابر ہو بھی جائیں تو خاصیت میں نہیں ہو سکتے۔ ہو سکتا ہے کچھ لوگ اعمال کی گنتی میں بہت آگے ہوں لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے وزن کے میزان میں ان لوگوں سے آگے نکل جائیں جن کے اعمال میں ہیروں کی خاصیت ہو۔ اس لیے حساب کتاب میزان کے سپرد ہے...... وزن میں...... گنتی میں نہیں...... کچھ سخی ہیں اور کچھ عالم ہیں۔ کچھ نمازی، اور کچھ پرہیز گار، کچھ اخلاق والے اور کچھ انصاف والے۔ کچھ گناہ کرتے ہیں، توبہ کرتے ہیں، توبہ توڑتے ہیں، پھر توبہ کرتے ہیں، لیکن کوئی نہیں جانتا کہ کبھی نہ گناہ کرنا والا میزان میں اُٹھ جانے والا ہے، یا بار بار گناہ کر کے توبہ کرنے والا جھک جانے والا ہے۔ کون خاصیت میں زمرد ہے، کون چاندی، کون سونا، کون ہیرا اور کون ''کوہ نور''۔

تین کوہ نور...... تین ہیرے...... ورنہ تین خاک نصیب...... اپنی اپنی سواریوں پر سوار، سر اٹھا کر، سر جھکا کر، تسبیح میں مصروف ہیں۔

انہوں نے اب جانا ہے کہ خاک کے پتلے کو سکون بھی خاک ہو کر ہی ملتا ہے۔ خاک چھان کر ہی ملتا ہے۔ در بدر خاک چھان جھٹک کر ہی ملتا ہے...... ورنہ کچھ نہیں ملتا ہے...... اس راہ میں، ورنہ اس راہ میں، انعام تو ملتا ہے، لیکن ''مقام'' نہیں ملتا۔

اپنے مقام، اپنے رتبے کی شان کو برقرار رکھتے ہوئے امیر کاروان، کاروان حج کی حفاظت سے غافل نہیں

تھے۔سب کچھ ٹھیک ٹھاک جا رہا تھا۔وہ پوری طرح سے چوکنا تھا۔قافلے والے خوش بھی تھے اور مطمئن بھی۔وہ کھانا کھا چکا تھا، پانی کے لیے مشک کو منہ سے لگایا ہی تھا کہ ابن منصور اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اس کے دل کا حسد بڑھ کر کینہ میں بدل چکا ہے۔کند تلوار کی طرح وہ خود کو ناکارہ سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔یہ سفر کا پچیسواں دن ہے......

''جن تین حاجیوں کے تم نے نام لکھوائے تھے، تم نے ان کے بارے میں بتایا نہیں کہ وہ کون ہیں؟''

امیر کاروان نے اطمینان سے پانی کی مشک کا منہ بند کیا۔''میں نے کوئی نام نہیں لکھوائے......'' سنجیدگی سے کہا۔یہ انسان حج کی تیاریوں کے پہلے دن سے اس کے پیچھے لگا ہوا تھا کہ کہیں کوئی موقعہ ہاتھ آئے اور وہ اسے ''امیر الحج'' کے عہدے سے دھکا دے کر خود اس کی جگہ آ کر کھڑا ہو جائے۔ورنہ اسے سب بڑوں کی نظروں میں ہی گرا دے۔

''کیا بات ہے تمہاری...... یاد آیا تم نے لکھوائے نہیں تھے، بلکہ خود لکھے تھے۔سواری کے لیے دو اونٹ تم نے شاہی اصطبل سے لیے تھے۔کن کے لیے تھے ابن موسیٰ؟'' وہ اسے امیر الحج نہیں کہتا تھا۔

''تم اندراج کی جانچ پڑتال کرتے رہے ہو؟ تم میری ٹوہ میں رہتے ہو؟ کس لیے؟ اس لیے کہ اس سال بھی امیر کاروان کا قرعہ میرے نام نکلا ہے۔حسد کرنا چھوڑ دو۔ہو سکتا ہے یہ میری زندگی کا آخری کاروان ہو جس کا میں امیر بنا ہوں۔آج کی رات میری آخری رات ہو، جو نماز میں نے پڑھی ہے وہ بھی آخری ہو۔پھر؟''

''تم مجھ پر اپنی زندگی کی بے ثباتی ثابت کر کے مجھے متاثر نہیں کر سکتے۔مجھے میرے سوالوں کے جواب دو۔''

''تمہارے سوال صحرا کے کانٹوں کی طرح نوکیلے اور ناکارہ ہیں۔صحرا کے ڈاکوؤں کی طرح خواہش کے غلام نہ بنو ابن منصور! اپنے نفس پر قابو پانا سیکھو۔'' اطمینان بھی اور مسکراہٹ بھی۔ابن موسیٰ نے ابن منصور کو جلا کر تنور کر دیا تھا۔

''تم نے کاروان میں کن لوگوں کو جگہ دی ہے ابن موسیٰ......'' اس کی آواز بلند ہو گئی۔

''میں تمہاری تشویش پر حیران ہوں۔یہ کاروان حج ہے، اور جو مسلمان اپنی سواری رکھتا ہے، کھانا پینا اور کچھ خرچ وہ اس میں شامل ہو سکتا ہے۔تمہیں اتنی فکر کیوں ہے؟''

''مجھے شک ہے کہ تم نے بدوؤں کے جاسوسوں کو کاروان میں جگہ دی ہے۔ یہ جاسوس کاروان پر حملہ کروا دیں گے۔ وہ اپنے سردار کو کاروان کے راستے کی خبر دیتے ہوں گے۔''

ابن موسیٰ نے بے یقینی سے اس پاگل کو دیکھا اور پھر ایکدم سے قہقہہ لگا دیا۔ ''تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟ میری والدہ بدوؤں کے ہاتھوں شہید ہوئی تھیں۔ میں بدوؤں سے سودے بازی کروں گا؟ تم پاگل ہو چکے ہو...... ہاں ہو چکے ہو۔'' بے وقوفوں کی باتوں سے خون کھول اٹھتا ہے اور حاسدوں کی باتوں سے انسان جل، بھڑک، تڑپ اٹھتا ہے۔

''ایمان بدلتے دیر نہیں لگتی......''

''لیکن عقل آنے میں بہت دیر لگ جاتی ہے۔'' اس نے اس کے شانے پر تھپکی دی۔ ''جاؤ جا کر صحرا کی سانس کے ساتھ سانس ملاؤ، شاید صحرا تمہیں کچھ حکمت سیکھا دے۔ مجھ پر نظر رکھنے سے بہتر ہے کہ تم اپنے دل پر نظر رکھو، کینہ عقل کا دشمن ہے، حسد اعمال کا، اور عداوت جان کی...... اپنی ان تینوں خصلتوں پر رحم کرو، اور انہیں مشقت سے نکال لو۔''

ابن منصور منہ پھیر کر چلا گیا۔ لیکن اس کی چال بتا رہی تھی کہ وہ باز آنے والا نہیں ہے۔

وہ ساری رات سفر کرتے، آسمان کے ستارے ان کے اشارے تھے، انہیں راستے بتاتے تھے۔ صحرا کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے گزرتے ہوئے ان کے ساتھ چار حاجی شامل ہوئے تھے۔ گاؤں والوں نے چار حاجیوں کو کچھ ایسے رخصت کیا تھا کہ دس ہزار کا کاروان مبہوت رہ گیا تھا۔ گاؤں کے لوگوں نے ان کا استقبال بھی کھلے دل سے کیا تھا۔ یہاں کنوئیں سے پانی پیتے ہوئے، منہ ہاتھ دھوتے ہوئے اس کی نظر امیر الحج کی طرف گئی تھی۔ وہ تینوں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھیں لیکن انہیں کوئی موقعہ ہی نہیں مل رہا تھا۔ عزیزہ کو تو معذرت بھی کرنی تھی اس کا گناہ بھی بڑا اور عظیم تھا۔

''امیر الحج اچھا انسان ہے، تم نے خواہ مخواہ اسے پتھر مارا......'' آمنہ کی یادداشت کی یہ خرابی تھی، ہر خراب بات یاد رکھتی تھی۔

''اس پتھر پر اسی کا نام لکھا تھا، اس پتھر کو اسی کو جا کر لگنا تھا۔'' عزیزہ کو ابھی تک پتھر مارنا حق بجانب لگ رہا

تھا۔

''دیکھنا کسی سانپ پر تمہارا نام نہ لکھا ہو، سنا ہے صحرا سانپوں کا گھر ہوتا ہے۔ تمہیں کاٹنے میں وہ سانپ بھی حق بجانب ہوگا۔''

صحرا سانپوں کا گھر تھا یا نہیں لیکن وہ عجائبات کا مرکز ضرور تھا۔ صحرا کی راتیں حسن کی پیشانی پر چوتھا چاند تھیں۔ جب تک ان کی نظریں اپنے حسن و جمال پر رہی تھیں وہ کائنات کے حسن تک نہیں پہنچ سکی تھیں۔ انسان خالق کی ثنائی تب ہی بیان کرے گا، جب وہ اس کی تخلیق پر غور کرے گا، ورنہ وہ خود میں ہی الجھا رہے گا۔

''میں ایسی رات میں ہزاروں سال تک سفر کر سکتی ہوں۔'' عزیزہ نے جذب کے عالم میں کہا۔

''اچھا...... اونٹ سے نیچے اترتے ہی تم اپنی کمر مسلنے لگتی ہو۔ تمہاری ہڈیوں کے چٹخنے کی آوازوں سے جانور تک بدک جاتے ہیں۔'' دن میں صحرا کی ریت گرم ہوتی تھی، رات میں آمنہ کی زبان گرم ہو جاتی تھی۔ وہ پچ (طنز) کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔

''میں حج کے لیے جا رہی ہوں اور تم مجھ پر طنز کر رہی ہو۔ عزت دو مجھے......''

''عزت کی حقدار تم اکیلی ہو کیا...... کل تم نے میرے پیٹ میں کیا چبھویا تھا، میری جان حلق میں آ گئی تھی۔''

''پتا نہیں تمہیں اونٹ پر بیٹھ کر نیند کیسے آ جاتی ہے، تمہارے خراٹوں سے اُونٹ کی چال ڈگمگا رہی تھی۔ اونٹ بان بھی کچھ خوفزدہ سا تھا۔ اس لیے میں نے تمہیں ایک بے ضرر سی لکڑی کی شاخ چبھو دی تھی۔''

''تم ایسے بے ضرر ہتھیار بھی اپنے ساتھ رکھتی ہو۔ تم حج پر جا رہی ہو یا جنگ پر...... کچھ شرم ہے یا نہیں؟''

''شرم کا کہہ کر مجھے شرمندہ نہ کرو۔ لکڑی کی وہ شاخ ابھی بھی میرے پاس ہے...... چپ کر کے بیٹھو، جاہل......''

آمنہ نے گھور کر اسے دیکھا اور سر کو جھٹک کر، منہ پھلا کر سامنے دیکھنے لگی۔ وہ کئی بار جنت سے کہہ چکی تھی کہ وہ عزیزہ کے ساتھ بیٹھ جائے، لیکن جنت اس خاتون کے ساتھ ہی چپکی ہوئی تھی۔ اسے اپنی والدہ بنا لیا تھا۔ ہر وقت ان کی خدمت میں لگی رہتی تھی۔ اونٹ سے اترنے کے بعد، قیام کے دوران وہ ان کے جسم کو آرام دینے کی

کوشش کیا کرتی تھی۔عورت بیمار تھی لیکن اپنی بیماری کو ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ بیمار کو کاروان میں شامل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کی بیماری کی نوعیت عجیب سی تھی، جسم اچانک بہت گرم ہو جاتا، کان اور ناک سے خون نکلنے لگتا تھا۔ پورا جسم کانپنے لگتا تھا، سر بہت زیادہ ہلنے لگتا تھا۔ اسی لیے وہ ہر وقت اپنا سر سختی سے باندھ کر رکھتی تھیں۔

''آپ کو تندرست ہو کر سفر کرنا چاہیے تھا۔ انسان کو خود پر بار نہیں ڈالنا چاہیے۔'' آمنہ نے کہہ ہی دیا تھا۔

''ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن پچھلے کئی سالوں سے میری یہی حالت ہے۔ دوا بھی بہت کھائی ہے لیکن بیماری شاید مجھے پسند کر بیٹھی ہے، جانے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ میں نے کہا لو پھر میں بھی تمہیں حج کر کے دکھاتی ہوں۔ تم میری جان ہی کیوں نہ لے لو۔ بیماری جسم چھوڑ کر جاتی یا نہ جاتی، اگر روح جسم کو چھوڑ جاتی تو میں کیا کرتی۔''

تینوں خاتون کی ہمت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکی تھیں۔ جنت تو اپنی پوری کوشش کرتی تھی کہ ان کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھ سکے۔ ایک بار عزیزہ اور آمنہ کے سامنے وہ جنت کی تعریفیں کر رہی تھیں کہ بہت پیاری لڑکی ہے۔ بہت سکھ دیا ہے مجھے۔

''میرا خیال ہے یہ جنت کو اپنے بیٹے کے نکاح میں لینا چاہتی ہیں۔ بار بار کہہ رہی ہیں کہ کسی کا اصل دیکھنا ہو تو سفر میں دیکھو۔ جنت مجھے کھری لگی ہے۔ کئی بار اپنے بیٹے کا ذکر بھی کر چکی ہیں۔''

''نکاح......'' عزیزہ چونکی تھی۔ ''نکاح کا پیغام بھی آ گیا۔'' وہ جنت کو دیکھ رہی تھی جو خاتون کو پانی پلا رہی تھی۔

''پیغام نہیں پاگل......اشارہ......''

''ہاں نکاح......اب ہمیں جلد سے جلد ان کے نکاح کا انتظام کر دینا چاہیے۔'' درویش کی بیوی نے درویش سے کہا تھا تو درویش نے ایک گہری سانس لی تھی۔

''بڑے دل والے، بڑی مشکلوں سے ملتے ہیں......جو اللہ کی رضا......''

درویش کی بات سن کر اسے یقین ہو گیا تھا کہ سب فرائض ادا ہو سکتے ہیں لیکن ان کے نکاح کا فرض ادا نہیں ہو سکے گا۔ کوئی انہیں اپنے نکاح میں نہیں لے گا۔ انہیں ساری زندگی چکی ہی پیسنی ہو گی۔ جو انہیں بخوشی قبول ہے۔ انسان کی خواہشیں کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ جنت کے گالوں کی شرم دیکھ کر، اس کے دل میں ایک ٹیس اٹھی تھی، شاید

خاتون نے اسے بھی کوئی اشارہ دیا تھا۔اس نے دل ہی دل میں دعا کی تھی کہ کاش ایسا ہو جائے کہ یہ خاتون اپنے بیٹے کے لیے جنت کا نکاح منظور کر لیں۔ حج پر جانے والوں کے دل کشادہ ہوتے ہیں اور صاف بھی۔اس نے سوچا کہ وہ حج سے واپسی پر خاتون کو ساری حقیقت بتا دے گی۔ پھر درویش سے ملوا دے گی۔اگر ان میں سے کسی ایک کا نکاح بھی ہو جاتا ہے تو یہ بہت بڑی بات ہو گی۔

جنت کی خدمت بے لوث تھی، اسی لیے اس میں اثر تھا۔خاتون پچھلے دس دنوں سے بیمار نہیں ہوئی تھیں۔وہ چاک و چوبند اور تر و تازہ تھیں۔وہ اس کی پیشانی چومتی تھیں۔اسے دعائیں دیتی تھیں لیکن کیا خبر حقیقت معلوم ہو جانے پر وہ اسے ایک نظر دیکھنا بھی پسند نہ کریں۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

''سوال معمولی ہی سہی ابن موسیٰ! تم جواب دے کر اپنی جان چھڑ والو۔بس......''

ابن موسیٰ کا غصے سے برا حال تھا۔وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ابن منصور نے یہ بات کاروان کے ساتھ آنے والے، مصر کے خاص عہدے داروں تک پہنچا دی ہو گی۔وہ سب با جماعت بیٹھے ہوئے اس کی سمت سوالیہ دیکھ رہے تھے۔

''کیا آپ لوگ مجھ پر شک کر رہے ہیں؟'' وہ حیران سب کی سوالیہ نظریں دیکھ رہا تھا۔

''تم پر اتنا یقین ہے کہ شک کی گنجائش نہیں......لیکن تاریخ گواہ ہے، پشت پر خنجر ہمیشہ اپنوں نے ہی گھونپے ہیں۔''

''نہ میں کسی جنگ کا حصہ ہوں نہ تخت کا......میری حیثیت کو پہچانیں......خنجر اور غداری کی باتیں کر کے میری توہین نہ کریں۔''

''تم خلیفہ کے پیاروں میں سے ایک ہو......'' ابن منصور نے طنزاً کہا۔

''تو آپ میرے دشمن کیوں بن گئے ہیں؟ کیا صرف اس لیے کہ میں اب تک وہ اکلوتا امیر الحج ہوں جس کے ساتھ اعلیٰ خاندانی حسب نسب منسوب نہیں ہے۔جس کے خاندان کی یا کسی عزیز بزرگ کی خلیفہ تک پہنچ نہیں ہے۔ میں اپنی لیاقت اور سمجھ سے اس عہدے تک پہنچا ہوں۔آپ اس کا بدلہ مجھ سے نہیں لے سکتے کہ میں عالم

اسلام کے ایک بڑے عہدے پر فائز ہوں۔ یہ اللہ کی مرضی بھی ہے اور میری لیاقت بھی......"

"تم اتنا بھڑک کیوں رہے ہو ابن موسیٰ! بس مجھے اتنا بتا دو کہ شاہی اونٹ تم نے کن کے لیے تھے؟"

"امیر الحج ہونے کی حیثیت سے میں جتنے چاہے اونٹ لے سکتا ہوں۔ جسے چاہوں کاروان میں شامل کر سکتا ہوں۔"

"لے سکتے ہو لیکن کن کے لیے؟"

ابن موسیٰ بری طرح سے جز بز ہو رہا تھا "وہ درویش کی بیٹیاں ہیں......" وہ سمجھ گیا تھا کہ سچ بتانا ہی ہوگا۔

ایک لمحے کے لیے سناٹا چھا گیا تھا۔ "قاہرہ کے درویش کی بیٹیاں؟ اس دیوانے کی بیٹیاں جسے گلی کوچوں میں اللہ اللہ کرنے سے فرصت نہیں...... جو اتنا غریب ہے کہ اپنے جوتوں کی مرمت بھی خود کرتا ہے۔ اور جس کے گھر کی عورتوں کے ہاتھ کا پیسا ہوا آٹا قاہرہ کی صاحب حیثیت عورتیں از رہ ہمدردی خرید لیتی ہیں۔"

"آپ کا درویش کے لیے ایسا لب ولہجہ سمجھ سے باہر ہے۔ وہ اللہ والے ہیں اور یہ کوئی گناہ نہیں۔"

"درویش کی دو بیٹیاں ہیں اور جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ چھوٹی ہیں۔ یہ کون سی بیٹیاں ہیں جنہیں درویش نے اکیلے ہی بھیج دیا ہے۔" ابن منصور کو اصل بات تک رسائی چاہیے تھی۔ اس کی دھنسی ہوئی آنکھیں حسد سے لبالب تھیں۔

"یہ ان کے بھائی کی بیٹیاں ہیں......"

ابن منصور نے سر ہلایا۔ "کیا تمہیں کسی نے بتایا ہے کہ جھوٹ بولتے ہوئے تمہارا سینہ پھولنے لگتا ہے۔"

ابن موسیٰ نے کڑی نظروں سے دیکھا۔ "کیا تمہیں کسی نے خبردار کیا ہے کہ امیر الحج کو کچھ قتل معاف ہیں......"

یہ بات زہر میں بجھے تیر کی طرح ابن منصور کو لگی تھی۔

"تم مجھے قتل کرو گے...... مجھے......؟"

"اب اپنی بکواس بند رکھو...... ہم کاروان حج میں شامل ہیں۔ کسوۃ الکعبہ اور محمل شریف ہمارے ساتھ ہیں۔ بہتر ہوگا کہ تم اپنا ذاتی عناد درمیان میں نہ لاؤ۔ میں کاروان کا امیر ہوں، مجھ سے دوبارہ اس لب و لہجے میں

بات نہ کرنا۔ حاجیوں کو اپنے شر سے بچاؤ۔" کہہ کر وہ غصے سے چلا گیا تھا۔

وہ جب سے امیر الحج بنا تھا، ان سب لوگوں کے دلوں پر سانپ لوٹ رہا تھا۔ وہ پہلا امیر الحج تھا جو کسی بڑے عہدے دار کا بیٹا، بھتیجا، بھائی یا داماد نہیں تھا۔ وہ پہلا امیر الحج تھا جس کی قابلیت اور لیاقت نے اسے کاروان کی سربراہی عطا کی تھی۔ اس کے استاد محترم خلیفہ کے دوستوں میں سے تھے، اور یہیں سے اس کے لیے امیر الحج بننے کے راستے بنے تھے۔ اس نے اپنے استاد محترم کو مایوس نہیں کیا تھا۔

انسان پیدا بھی نہیں ہوا تھا اور حسد پیدا ہو گیا تھا۔ حسد اتنی پرانی بیماری ہے۔ اس حسد نے شیطان کو کہیں کا نہیں چھوڑا تو یہ حسد انسان کو کہاں کا چھوڑے گا۔ اسے خلیفہ کے حاسدین کی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔ وہ صرف چند لوگوں کو جواب دہ تھا۔ درویش نے ٹھیک کہا تھا، لوگ اسلام پر ایمان تو لے آئے ہیں لیکن وہ اپنے دلوں میں اسلام نہیں لائے۔ جو مذہب امن و سلامتی ہے، اسے یہ اپنے لیے جنگ و جدل کا میدان بنا رہے ہیں۔ بڑے عہدوں کے ساتھ بڑی ذمہ داریاں اور بڑے دشمن آتے ہیں...... ابن موسیٰ کا سب سے بڑا دشمن ابن منصور تھا......

ابن منصور......

اتنے بڑے کاروان میں سے ان لوگوں کو ڈھونڈنا آسان نہیں تھا جو درویش کے گھر سے تھے۔ ایک ایک کا نام لینا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ اندراج موجود تھا لیکن وہ امیر الحج کے قبضہ میں تھا۔ لیکن تب یہ آسان ہو گیا تھا جب کاروان کے سفر کے ستائیسویں دن، پڑاؤ کے وقت، تین لڑکیاں امیر الحج کے پاس کھڑی کچھ کہہ رہی تھیں۔

"یہ صرف آپ کی وجہ سے ہوا ہے کہ ہم اس جگہ، اس مقام پر کھڑے ہیں۔ ہم نے زمین کے مختلف حصوں پر نمازیں ادا کی ہیں، تلاوت قرآن پاک کی ہے...... اجنبی ہواؤں کے سلام وصول کیے اور میٹھے کنوؤں کے پانی پیئے ہیں...... یہ سفر...... یہ صرف آپ کی وجہ سے ممکن ہوا ہے......"

"میری وجہ سے......" اس نے عزیزہ کو دیکھا۔ "لیکن تم نے کہا تھا تمہارا امیر "رب العالمین" ہے۔ یہ اس کی وجہ سے ہوا ہے۔"

"درویش کا کہنا ہے کہ اللہ ہمیں جو آسانیاں عطا کرتے ہیں، اس کا ذریعہ کوئی نہ کوئی ضرور بنتا ہے۔ ہماری اس آسانی کا ذریعہ آپ بنے ہیں۔ اس لیے ہم آپ کا شکریہ ادا کر رہی ہیں۔" عزیزہ اس کی یادداشت پر حیران

تھی ۔ کیسا انسان تھا درگزر کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔

''شکریہ..... پتھر مار کر..... یا پتھر مارے بغیر.....'' ایک دم سے اس کے منہ سے نکل گیا تھا۔ وہ سنجیدہ صورت کھڑا تھا، کاروان کا سربراہ تھا، ایسے مذاق یا طنز اسے زیب نہیں دیتے تھے..... تو پھر وہ سب نازیبا کام ہی کیوں کر رہا تھا.....

عزیزہ نے جھٹکے سے سر اٹھایا تھا۔ ''ایک معمولی سا پتھر تھا، بھول بھی جائیں اسے.....'' وہ شرمندہ کم ہوئی تھی، بل زیادہ کھایا تھا۔ جنت اور آمنہ خاموش کھڑی تھیں لیکن دل ہی دل میں ہنس رہی تھیں ۔عزیزہ کتنی جلدی بھڑک اٹھتی ہے۔ آمنہ سوچ رہی تھی۔

''پتھر تو معمولی ہی ہوتے ہیں، لیکن جس نیت سے مارے جاتے ہیں، وہ نیت غیر معمولی ہوتی ہے۔'' ابن موسیٰ نے بات کہہ کر حیرت سے اپنی بات کو محسوس کیا۔ وہ ایسی باتیں ایک لڑکی سے کیسے کر سکتا ہے۔ اتنا شرمندہ کس لیے کرنا.....

''میں کوئی شیطان تو نہیں تھا جسے کنکر مارا۔'' کہنے سے باز وہ پھر بھی نہیں رہا تھا۔

عزیزہ کو سمجھ نہیں آئی کہ وہ کیا کرے، کہاں جا چھپے۔ ''اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب ہمیں ٹھوکر لگتی ہے تو ہم ذرا سنبھل کر چلنے لگتے ہیں۔''

''ٹھوکر اور کنکر میں فرق ہوتا ہے۔ تم نے کہا تھا کہ مجھ پر پہاڑ اٹھا کر دے مارو گی..... اہرام بھی.....''

جنت نے تو کچھ سنجیدگی ظاہر کر دی لیکن آمنہ اپنی ہنسی قابو میں نہیں رکھ سکی تھی۔ وہ ایک دم سے منہ پر ہاتھ رکھ کر کھسک گئی تھی۔ عزیزہ خفت سے دونوں کو دیکھ کر رہ گئی اور امیر الحج کے قریب سے دور ہٹ گئی۔ ''کچھ گناہ (کنکر) بہت بھاری پڑتے ہیں۔'' وہ زیرِ لب بڑبڑائی تھی۔ پاؤں جھٹک جھٹک کر چل رہی تھی۔ ابن موسیٰ مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

ابن منصور بھی آنکھوں کو اندر دھنسائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ ان چاروں کو باتیں کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ ان تینوں کے پیچھے لپکا تھا۔

''درویش نے مجھ سے کہا تھا کہ میری بیٹیوں کا خیال رکھنا، لیکن میں چوک گیا۔ میں تمہارا چچا ہوں، درویش

کا عزیز دوست، ابن منصور۔" وہ ان تینوں کے قریب جا کر کھڑا ہوا تھا۔ تینوں کے چہروں پر چادر کے پلو کھنچے ہوئے تھے۔ وہ تینوں تذبذب کا شکار تھیں۔ انہیں درویش نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا کہ کوئی ابن منصور نام کا چچا ہے، ان کا دوست ہے۔ لیکن پھر وہ درویش کو کیسے جانتا تھا، اور ان تینوں کو بھی۔

"کوئی مشکل ہو تو تم مجھ سے کہہ سکتی ہو۔" وہ ان کے تذبذب کو دیکھ رہا تھا۔

"جی کیوں نہیں......" آمنہ نے کہا تو ابن منصور کے چہرے پر مسکراہٹ در آئی تھی۔ یقیناً وہ تینوں درویش کی بھتیجیاں ہی تھیں۔

"تم تینوں بہنیں ہو؟"

تینوں کے چہرے کے رنگ بدلے جو ابن منصور سے چھپے نہیں رہ سکے تھے۔

"جی......بہنیں ہی سمجھ لیں......" عزیزہ نے فوراً کہا۔

"بہنیں ہی سمجھ لیں......" ابن منصور زیر لب بڑبڑایا......" والد کیا کرتے ہیں، کیا نام ہے ان کا؟ قاہرہ میں ہی ہوتے ہیں؟"

تینوں کے رنگ اجڑ کر سیاہ ہو چکے تھے۔ ان کے چہرے چھپے ہوئے تھے لیکن ان کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ ابن منصور کو حیران کر گئی تھی۔ تینوں جواب دیے بغیر پلٹ کر جانے لگی تھیں۔ ابن منصور حیران انہیں دیکھ رہا تھا۔ تیزی سے جاتے ہوئے، اپنی چادر کو درست کرتے ہوئے گھبراہٹ میں عزیزہ کا ہاتھ کچھ زیادہ ہی سر کی سمت بلند ہو گیا تھا...... کہ اس کے ڈھیلے کرتے کی آستین ڈھلک کر کہنی تک جا پہنچی تھی......اور......

ایک رسم ہوا کرتی ہے، جس بچی کو قحبہ خانے لایا جاتا ہے، گرم سلاخ سے اس کے جسم پر ایک نشان داغ دیا جاتا ہے...... کچھ کے گردن کے نیچے، کچھ کے شانے پر، اور کچھ کے کہنی سے ذرا اوپر بازو پر......

کہنی سے ذرا اوپر بازو پر...... عزیزہ کا وہ نشان، ابن منصور کے سامنے نمایاں ہو کر چھپ چکا تھا۔ دو لڑکیاں آگے جا چکی تھیں، عزیزہ کچھ پیچھے تھی، وہ لپک کر عزیزہ کے سامنے جا کر کھڑا ہو چکا تھا۔

"تو تمہیں اپنے باپ کا نام معلوم نہیں ہے، نہ ہی پیشہ......" اس نے ہاتھ بڑھا کر جھٹکے سے اس کا نقاب کھینچ دیا تھا۔ عزیزہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔

''طوائف اپنی چال سے، ورنہ اپنی خوشبو سے......ورنہ اپنی کھال سے پہچان لی جاتی ہے......''اس کا ہاتھ کھینچ کر، آستین کو کہنی کے اوپر جھٹکے سے چڑھا کر وہ اس کے نشان کی سمت اشارہ کر رہا تھا۔ کڑی درویش سے شروع ہو کر ابن موسیٰ سے جا ملی تھی۔ عزیزہ ششدر ابن منصور کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اتنی حواس باختہ ہو چکی تھی کہ گردن موڑ کر جنت اور آمنہ کو بھی نہیں بلا سکی تھی۔

''طوائفیں حج پر جا رہی ہیں......ہم پر خدا کا قہر نازل ہوگا......ہم صحرا میں تباہ و برباد ہوں گے۔''ابن منصور نے بلند آواز سے کہا تھا۔ جنت اور آمنہ کے کانوں میں لفظ''طوائف''پڑا تو انہوں نے حیرت سے پلٹ کر ابن منصور کو دیکھا۔

''آپ کو شرم آنی چاہیے ایسی باتیں کرتے ہوئے......''عزیزہ کی آواز کانپ رہی تھی۔

''شرم تو تم تینوں کو آنی چاہیے، ورنہ ابن موسیٰ کو......طوفان ہم سے ٹکرائیں گے۔ ہم ذلیل و رسوا ہوں گے۔ اس کاروان کے ساتھ غلاف کعبہ ہے......اور اسی کاروان کے ساتھ''تین طوائفیں......''ہم اللہ کے عذاب کے مستحق ہیں۔ تف ہے امیر کاروان پر۔''

آمنہ اور جنت جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی تھیں۔ عزیزہ ابن منصور کی نفرت انگیز باتوں کی تاب نہیں لا پا رہی تھی۔

''ہم توبہ کر چکی ہیں......''وہ رو ہی دی تھی۔

''تم ہمیں برباد کر دینے والی ہو......''ابن منصور نے نفرت سے ان تینوں کو دیکھا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

بڑے عہدے جو بڑے دشمن لاتے ہیں، وہ ان ہی دشمنوں میں گھیر کر کھڑا ان کے سوالوں کا جواب دے رہا تھا۔

''وہ مسلمان ہیں......ہر مسلمان کا اللہ کے گھر پر حق ہے......''وہ اپنا غصہ ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''وہ طوائفیں ہیں......''

''وہ انسان ہیں......بس انسان......''

''ان کے جسموں پر ماضی کے نشان موجود ہیں......ان کے گناہ......''

''میں کسی نشان کو نہیں جانتا۔ میں یہ جانتا ہوں کہ اگر کوئی حج پر جانا چاہتا ہے، تو کاروان میں اسے شامل کیا جاتا ہے۔''

''حج پر حاجیوں کو لے کر جایا جاتا ہے......ایسے ذلیل لوگوں کو نہیں۔''

''دلوں کے حال اور اعمال کا حساب اللہ پر چھوڑ دیں......''

''اللہ نے معاملات طے کرنے کا اختیار انسان کو دیا ہے......''

''امیر الحج ہونے کی حیثیت سے میں نے جو مناسب سمجھا وہ کیا۔ میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔''

''اگر یہ سب درست تھا تو تم نے چھپا کر کیوں رکھا؟''

''اس لیے کہ آپ کی سوچ تنگ ہے......''

''یہ تمہارا کاروان نہیں ہے، یہ کاروان مصر ہے......تم جواب دہ ہو، اور تمہیں اس غلطی کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔''

''اگر آپ نے غلطی ثابت کر دی تو میں سزا بھی بھگت لوں گا۔ بہتر ہوگا کہ مجھے مصر واپسی تک دوبارہ کسی سوال کے لیے زحمت نہ دی جائے......وہ تینوں لڑکیاں بھی کاروان کا ساتھ ہیں۔ مجھے ان کے ماضی سے کوئی مطلب نہیں ہے، جیسے مجھے آپ سب کے ماضی سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ مجھے کسی حاجی کے اعمال اور اس حاجی کے دل کے حال سے بھی کوئی سروکار نہیں ہے۔ میں امام کعبہ سے اس سلسلے میں ضرور بات کروں گا اور ان سے درخواست کروں گا کہ وہ خطبہ حج میں اس مسئلے پر بھی روشنی ڈالیں......''

ابن منصور کا چہرہ غصے سے سرخ ہو چکا تھا۔ ''تم ڈھیٹ ہو۔ تم اس عہدے کے لائق نہیں ہو۔''

''ہاں ابن منصور! میں ڈھیٹ ہوں لیکن اس عہدے کے لائق بھی میں ہی ہوں کیونکہ میرا دل صاف ہے۔ اب میں سمجھا کہ امیر الحج ......امیر کیوں کہلاتا ہے......کیونکہ وہ ہر منفی بات پر غالب آتا ہے۔ وہ صحرا کے ڈاکوؤں اور شیطان کے حملہ آواروں، دونوں سے لڑتا ہے......جب وہ جیت جاتا ہے تو پھر وہ ''امیر'' کہلاتا ہے......''

''یہ تمہارا آخری کاروان ہے جس کے تم امیر ہو......'' ابن منصور نے دانت پیس کر کہا۔

حاجیوں کا کاروان چلتا رہا۔ ان تینوں کے اونٹ انہیں اپنا سوار بنا کر آگے بڑھتے رہے۔ انہیں گمان بھی

نہیں تھا کہ جس سفر پر وہ نکلی ہیں، وہ سفر دراصل کتنا لمبا ہو جانے والا ہے۔ یہ سفر، اس کی منزل انہیں کہاں لے جانے والی ہے۔ انہیں اونٹ کی کوہان سے آسمان قریب لگتا تھا۔ صحرا کی ریت پر سجدہ کرتے، اللہ کا قرب نصیب ہوتا تھا۔ انہیں یہ یقین حاصل ہو چکا تھا کہ دنیا میں جتنے خوش قسمت لوگ موجود ہیں، وہ ان میں سب سے زیادہ خوش قسمت ہیں......

وہ خوش قسمت تھیں، لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ وہ کاروان کے ساتھ حج پر جانے والی نہیں تھیں۔ آج کی رات سے اگلی رات......وہ اس سفر سے نکال دی جانے والی تھی......

وہ تینوں......تینوں ہی......کوڑیوں کے مول فروخت ہو جانے والی تھیں......

آمنہ......جنت اور عزیزہ......

سر بازار......ان کی وہ قیمت لگنے والی تھی......جو آج سے پہلے کسی انسان کی نہیں لگی تھی......

☆ ...... ☆ ...... ☆

(باقی آئندہ ان شاء اللہ)

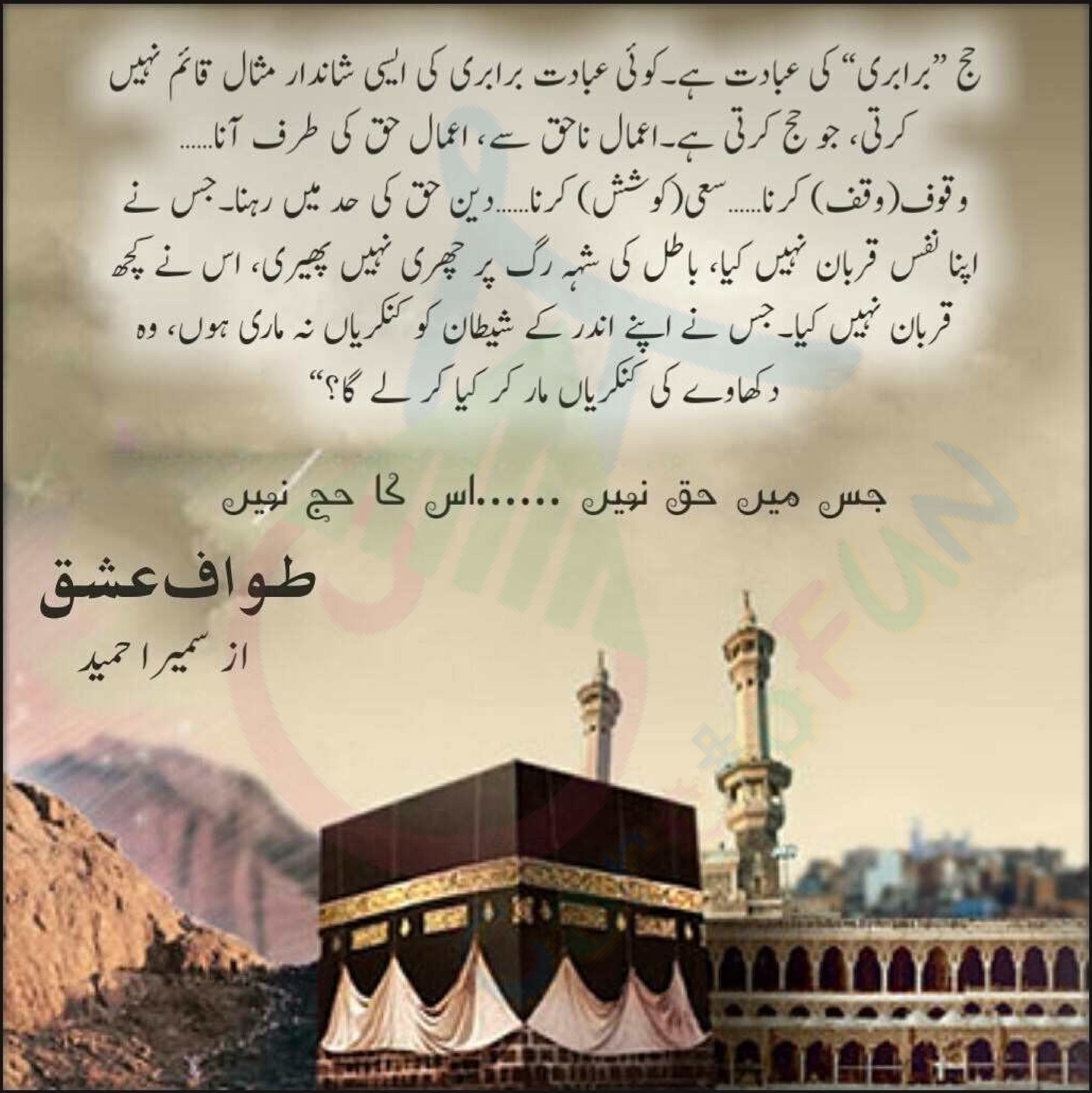
حج "برابری" کی عبادت ہے۔کوئی عبادت برابری کی ایسی شاندار مثال قائم نہیں
کرتی، جو حج کرتی ہے۔اعمال ناحق سے، اعمال حق کی طرف آنا......
وقوف(وقف) کرنا...... سعی(کوشش) کرنا.....دین حق کی حد میں رہنا۔جس نے
اپنا نفس قربان نہیں کیا، باطل کی شہہ رگ پر چھری نہیں پھیری، اس نے کچھ
قربان نہیں کیا۔جس نے اپنے اندر کے شیطان کو کنکریاں نہ ماری ہوں، وہ
دکھاوے کی کنکریاں مار کر کیا کر لے گا؟"
جس میں حق نہیں ......اس کا حج نہیں
طواف عشق
از سمیرا احمید

رب العالمین کے نام سے شروع

”طواف عشق“

دوسری اور آخری قسط

☆ ...... ☆ ...... ☆

عزیزہ......اس نے جانا کہ حج کی عبادت دراصل سفر کی طرف مائل کرتی ہے۔اللہ نے سفر کو پسند کیا ہے۔ جو گھر سے باہر نہیں نکلے گا، وہ اللہ کی حمد کیسے بیان کرے گا۔ وہ دریا، سمندر، صحرا، جنگل، پہاڑ...... عالم جہاں ...... کیسے دیکھے گا؟ وہ کیسے جانے گا کہ اس کے رب نے کیا کچھ تخلیق کیا ہے۔ ہر شے کیسے اس کی صفات کا مظہر ہے۔ جب ”جہاں“ ہی نہیں دیکھے گا تو ”خالق جہاں“ کیسے دیکھے گا۔ عالم جہاں کا علم نہیں رکھے گا تو ”رب عالمین“ کو کیسے پہچانے گا۔

اللہ چاہتا ہے کہ اس کی مخلوق سے ملا جائے، اسے دیکھا، سنا اور جانا جائے۔ ہر انسان کے پاس رب کی ایک صفت ہے......... ایک رب...... جسے صرف اس نے تلاش کیا ہے، اس تلاش میں حصہ دار بنا جائے۔اس کے پاس اپنی ایک کہانی ہے، جو کسی دوسرے کی نہیں ہے، اس کی وہ کہانی سنی جائے۔ جب خدا نے سب سے زیادہ محبت، انسان سے کی ہے، تو پھر انسان کو بھی سب سے زیادہ محبت انسان سے ہی کرنی ہے۔ اپنی بستیوں سے نکل کر دوسرے انسانوں کی بستیوں میں جا کر، رہا، کھایا، پیا اور سیکھایا جائے۔ انسان کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا، اور اللہ چاہتا ہے کہ انسان سفر میں رہے۔ بچپن، جوانی، بڑھاپا...... روح، زندگی، موت، بعداز موت...... وہ گھر سے نکل کر زمین کا ہو یا، عقل سے آگے علم و شعور اور روح کی بیداری کا۔

حج کا سفر...... ہر صاحب حیثیت پر فرض...... صاحب چاہت، صاحب عقل پر...... اللہ کی پہچان کا سفر...... مقصود کے لیے ہر راہ کا سفر......

عزیزہ......اس کا جی یہ منظر دیکھ دیکھ کر بھرتا نہیں تھا کہ صحرا سجدہ گاہ (جائے نماز) ہے، جس پر وہ سب سفر حج کی نماز پڑھ رہے تھے۔ زمین ان کی سواری تھی، جس پر رینگ کر، چل کر، دوڑ کر، بھاگ کر وہ مرکز کی سمت جا رہے تھے۔ کاروان کے ساتھ، اونٹوں پر سوار...... اونٹ ...... جو کبھی اپنے سوار کو گرنے نہیں دیتا اور اس کے لیے بڑے احترام سے جھکتا ہے۔

دن کے پڑاؤ میں عزیزہ نے امیر کاروان کو ابن منصور کی بات بتانی چاہی تھی لیکن آمنہ نے اسے منع کر دیا۔

”چھوڑ دو عزیزہ! امیر کاروان پر اتنے بڑے کاروان کی ذمہ داری ہے، ہمارا کیا ہے، آ جائے ساری دنیا اور مار لے سو جوتے۔ حج کے لیے جا رہے ہیں نا، تو پہلے اپنے ماضی کی کنکریاں کھا لیتے ہیں۔ مار لینے دو لوگوں کو گناہوں کے پتھر یلے طعنے۔ اللہ کے گھر تو سب برابر

ہو جاتے ہیں نا......ہم حاجی ہی کہلائیں گے.....دیکھ لینا......"

"درویش نے کہا تھا کہ وہم نہ کرنا لیکن عزیزہ! کیا ہماری وجہ سے کاروان پر کوئی مصیبت آسکتی ہے؟" اب جنت کو بھی وہم ستانے لگے تھے۔ابن منصور نے انہیں سہا دیا تھا۔

"دل تو میرا ابھی ڈرتا ہے، لیکن مجھے درویش کی بات پر یقین ہے کہ اللہ کے رحم پر شک نہ کیا جائے، بلکہ یقین رکھا جائے۔ہمیں یہ بھول جانا چاہیے کہ ہم کون تھیں، بس یہ یاد رکھنا ہے کہ ہم کون ہیں۔اب جاؤ تمہیں تمہاری ہونے والی ساس آواز دے رہی ہے......" وہ پانی کے لیے جنت کو آواز دے رہی تھیں، اور بہری جنت کی بجائے کان والی عزیزہ نے سن لیا تھا۔

"توبہ توبہ! ایسی باتیں تو نہ کرو.....شرم کرو......" جاتے جاتے جنت نے شرما کر کہا۔

"شرم میں کرلوں گی، تم دعا کرو کہ ایسا ہو جائے۔اپنی ساس کے دل پر پڑھ پڑھ کر پھونکا کرو، دل بدل جائے گا ان کا۔"

"اُفف عزیزہ! انہیں خواہ مخواہ میری ساس بنا دیا ہے۔" جنت کے گال گلابی ہو چکے تھے اور کہتی تھی اُفف، اُفف۔

"کتنی بار تو کہہ چکی ہیں کہ حج سے واپسی پر بیٹے کا نکاح کرنا ہے، کہتیں بھی ہم دونوں سے ہیں۔ہم اندھے یا پاگل تو نہیں......سب سمجھتے ہیں......"

سب سمجھ کر وہ سب کچھ بھلا چکی تھیں، اپنا ماضی، اپنا لقب۔امیر الحج، کاروان میں حاجیوں کی خبر گیری کر رہے تھے۔کچھ لوگ بیمار ہو چکے تھے، انہیں کچھ عام فہم مشورے عنایت کیے جا رہے تھے۔لیکن چونکہ وہ طبیب نہیں تھا، امیر تھا، اور اسے بیماروں کا علاج کرنا نہیں آتا تھا۔یا دعا آتی تھی یا مزاج پرسی تو وہ تھوڑا خائف ہوتا جا رہا تھا۔بیماروں کو لگتا تھا کہ وہ ہر فن مولا ہے، تلوار رکھتا ہے تو دوا بھی رکھتا ہوگا۔وہ معصوم یہ نہیں جانتے تھے کہ تلوار رکھنے والا "وار" رکھتا ہے یا "دفاع"......ورنہ للکار......دوا کا یہاں کیا کام......وہ اس سے سفر کے دوران لاحق ہونے والی عارضی بیماریوں کا علاج پوچھ رہے تھے۔خصوصی طور پر پیٹ میں گڑبڑ اور سر چکرانے کی بیماریوں کے بارے میں......

"میں امیر ہوں......طبیب نہیں......" وہ چڑ ہی گیا۔وہ کوئی خاتونِ ٹوٹکہ تھا، وہ تو محترم ابن موسیٰ تھا۔

"امیر تو باپ کی طرح ہوتا ہے، شفیق اور مہربان......"

ابھی وہ خود باپ بنا نہیں تھا کہ اتنے بڑے کاروان کا باپ بن گیا تھا۔چچی ٹھیک کہتی ہیں نکاح کر لو ورنہ دنیا ایسی ایسی زبان میں طعنے مارے گی کہ سینہ چھلنی کر دے گی......کر دیا تھا نہ چھلنی......سینہ، ہاتھ، پیر......سب......

"امیر تک تو ٹھیک ہے، لیکن باپ؟ یہ کیا ہوتا ہے......" وہ پیٹ کے عارضے میں مبتلا بیمار پر غصہ کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"بہت سارے بچے ہوتے ہیں نا ان کا والد محترم ہونا......" جو اونٹ بان اسے نکاح کا مشورہ دے چکا تھا، اب وہ دانت نکال کر اس کی معلومات میں اضافہ کر رہا تھا۔

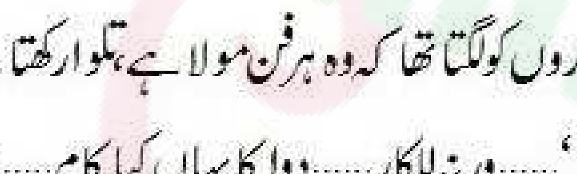

"تمہارا نکاح ہو چکا ہے......؟"

یہ اونٹ بان ہر طنز پر جواب دینے کے لیے اس کی پشت کے پیچھے ہی موجود ہوتا تھا۔جان کے دشمن ہمیشہ آگے پیچھے ہی موجود رہتے

ہیں، ساری طنزیہ باتیں سب سے پہلے یہی سنتے ہیں......دشمنوں میں شریک......جی جان جلاتے فریق......بدتمیز، بدتہذیب۔

''ہاں جی! اسی لیے تو میں کسی کو آزاد، خودمختار، خوش حال نہیں دیکھ سکتا۔امیر! آپ بھی یہ شکنجہ اپنی زندگی کے گرد کس لیں، یقین جانیں صبر وضبط کے ایسے ایسے مرحلوں سے گزریں گے کہ مرجانا چاہیں گے یا مار دینا......لیکن ہوگا تیسرا کام ''مار دیے جائیں گے''۔''

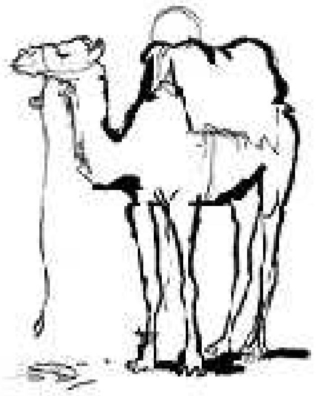

وہ بے ساختہ ہنس دیا۔''تو ایسے کہو مجھے خوش باش دیکھ کر جل جاتے ہو۔''

''اپنا دل جلا ہوا ہو تو جی چاہتا ہے سب ایسے ہی جلے بھنے رہیں......''

''کیسی عورتوں جیسی باتیں کر رہے ہو......''اس نے قہقہہ لگایا۔

''عورت سے ہی سیکھی ہیں......زوجہ سے......''اس کے دانت پھر باہر آئے تھے۔

عورتانہ اونٹ بان کی ٹھوڑی کو اپنی چار انگلیوں سے مسل کر، رگڑ کر وہ آگے بڑھ گیا۔کاروان میں گھومتے پھرتے اس نے ان تینوں کو ایک اونٹ (بے چارے) سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔عزیزہ نے اونٹ (آہ......معصوم) کی منہال پکڑی ہوئی تھی اور وہ اسے بڑی محبت سے ہولے ہولے جھٹک کر اپنے سوالوں کی طرف متوجہ کر رہی تھی۔یعنی وہ اس سے کچھ قصے کہانیاں سننا چاہتی تھی۔یعنی کیا اسے اونٹ کی زبان آتی تھی؟ یعنی کیا اونٹ کو اس کی زبان سمجھ میں آتی تھی......یعنی کیا......اسے اونٹ سے ہی قصے کہانیاں سننی تھی۔انسان مر گئے تھے کیا؟......دو میں سے ایک ''یا اللہ مجھے ان سے بچالے'' کی صورت بنے اونٹ کو پتا نہیں کیا کھلانے کی کوشش کر رہی تھی۔دوسری اس کا منہ تک کھولنے کی تگ و دو کر رہی تھی۔وہ نہیں کھول رہا تھا تو جھلا کر کہہ رہی تھی ''یہ تو منہ ہی نہیں کھول رہا''۔ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ نیچے سے اپنی لمبی ٹانگ چھوڑ دیتا، جو ان میں سے کسی ایک کو تو جا لگتی، اور پھر وہ ان سے پوچھتا۔''میری جان چھوڑو گی یا یہ جہاں......؟''

''یہ جہاں......پر تم پر سوار ہو کر......''عزیزہ کہتی......یقیناً یہی کہتی......

''کارواں والے جسمانی بیمار ہیں اور یہ تینوں ذہنی......''امیر کاروان نے زیر دل کہا......یقین سے کہا......

ذہنی بیماروں میں سے ایک بیمار ''عزیزہ'' تک اس کے تندرست ذہن کی سوچ پہنچی تھی۔اس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔اونٹ کی منہال پکڑے پکڑے دیکھا......ہوا کچھ تیز تھی، اور اس کی چادر، اس کا لباس پیچھے کی طرف کھنچا اڑا جاتا تھا۔

امیر کارواں......وہ ایک لمحے کے لیے بھول گیا تھا کہ وہ کہاں کھڑا ہے۔عزیزہ نے سر واپس کھینچ کر اونٹ کے ساتھ اونٹوں والی باتیں کرنی شروع کر دی تھیں۔وہ باتیں جو اونٹ واقعی میں سمجھ لیتا تو رک کر عزیزہ سے کہتا،

''یہ کیا ہانک رہی ہیں آپ......؟ مجھے صرف جانور ہی سمجھا جائے، اپنی طرح کا پاگل نہیں۔''

پاگل عزیزہ......امیر کاروان آگے بڑھ گیا تو اس نے ڈھکی چھپی نظروں سے ابن موسی کو دیکھا۔انسان کے پاس دعا میں بہت کچھ مانگ لینے کا اختیار ہوتا ہے۔بہت کچھ جائز......بہت کچھ ضروری......معاملہ اللہ کے ساتھ ہو تو کوئی بھی معاملہ طے پا سکتا ہے۔تو کیا وہ زندگی کے کاروان کے امیر سے، حج کے کاروان کے امیر کی بات کرے؟ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔اونٹ کی منہال کو اپنی ہتھیلی سے رگڑ رہی تھی۔اب اونٹ سے اونٹنی باتیں کرنا بھول گئی تھی۔

دوسری اور آخری قسط

''تمہیں کیوں ایک دم سے چپ لگ گئی ہے؟ اونٹ نے تمہیں بدصورت تو نہیں کہہ دیا۔ چلو مان جاؤ اب کہ تم بد شکل سی ہو۔'' آمنہ کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے دیتی، ایسا ہوسکتا تھا اگر وہ دیوانی ہو جاتی یا اندھی بہری۔

''فی الحال تو مجھے اونٹ کی زبان سمجھ میں نہیں آ رہی، جسے سمجھ میں آ رہی ہے وہ قیامت خیز جلن کا اظہار کر رہی ہے۔'' ادا سے آنکھیں گھمائیں۔ وہ خوش تھی۔ وہ چہک سکتی تھی۔

''اب انسان سچ بھی نہ بولے۔ سچ تو ویسے یہ اونٹ بھی بولتا ہے، مجھے بتا رہا تھا کہ جب تم اس پر بیٹھتی ہو تو اس کا جی چاہتا ہے کہ تمہیں پٹخ کر نیچے دے مارے...... باقی کی ہڈیاں بے شک سلامت رہیں لیکن ایک گردن کی ہڈی ٹوٹ جائے بس......''

''تمہیں دے کر مارا تو تھا دوبار...... ایسا درویش اونٹ تک تم سے عاجز آ گیا تھا......''

''وہ میں پھسل گئی تھی......'' یادداشت عزیزہ کی بھی کمال کی تھی۔

''پورے کاروان میں تم اکیلی لڑکی ہو جو اونٹ سے پھسل جاتی ہے، تمہاری قابلیت ہمیشہ سے ہی قابل تعریف رہی ہے۔''

''منہ بند رکھو اپنا! میں کاروان حج میں شامل ہوں، اللہ کے گھر جا رہی ہوں، تمہاری وہاں شکایت کر دی نا...... تو پھر نہ کہنا......''

''اچھا اچھا! یعنی تم اکیلی جا رہی ہو، شکایتیں صرف تمہاری سنی جائیں گی، میرے منہ میں تو زبان ہی نہیں ہو گی۔''

''تمہارے منہ میں ایک نہیں کئی زبانیں ہیں اور خیر سے کوئی ایک بھی اچھی نہیں ہے، مجھ سے اچھی اچھی باتیں سیکھ لو۔''

''تمہیں میں اچھی طرح سے سبق نہ سکھا دوں...... یہی کوئی تین چار......'' وہ آمنہ کے بال پکڑ کر کھینچ رہی تھی۔

بہت دور...... بہت آگے...... امیر کاروان نے یہ منظر دیکھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ عزیزہ میں تندی کچھ زیادہ ہی ہے۔ اگر جائز ہوتا تو شاید وہ بھی امیر کاروان بن جاتی۔ عالم اسلام کی پہلی ''خاتون کاروان''۔

خاتون کاروان نے آمنہ کے بال نہیں چھوڑے تھے۔ آمنہ دبی دبی چیخیں مار رہی تھی۔ کچھ عورتیں انہیں دیکھ کر ہنس دی تھیں۔

''تم میری جان کی دشمن ہو......'' آمنہ چلا رہی تھی۔

''تمہاری زبان کی دشمن ہوں میں...... کسی وقت سو رہی ہو گی تو کاٹ دوں گی یہ زبان......''

''میں تمہاری یہ چوٹیاں کاٹ دوں گی، دیکھنا گنجا کر دوں گی۔ بچے دیکھ کر ہنسیں گے تمہیں...... ہی ہی......''

کاروان والے دیکھ کر ہنس رہے تھے...... ہی ہی...... آمنہ باز ہی نہیں آ رہی تھی۔ عزیزہ کو اپنے بال بہت عزیز تھے نا، بالوں پر آنچ آتی تھی، تو بھڑک اٹھتی تھی۔ اب بھی وہ بھڑک اٹھی تھی اور اونٹ بان کے ہاتھ میں لہراتی شاخ کو کھینچ کر آمنہ کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ بھاگ بھاگ کر آمنہ نے ریت پر طوفان برپا کر دیا تھا۔

''تمہاری بہنیں پاگل ہو چکی ہیں......'' جنت کی ہونے والی ساس نے شرارت سے کہا۔

''ہو چکی ہیں...... مطلب؟ یہ پاگل ہی ہیں...... میرا حوصلہ ہے جو ان کے ساتھ گزارا کرتی رہی ہوں۔'' آہ بھر کر کہا۔

ساس صاحبہ دل کھول کر ہنسیں۔ ''ایک سے بڑھ کر ایک ہو سب...... جاؤ تم بھی ان کے ساتھ تھوڑا پاگل ہو جاؤ۔''

دو پاگلوں کے قافلے میں تیسری پاگل بھی شامل ہوگئی۔اس نے اپنی مٹھیوں میں ریت بھر لی تھی اور بڑی شرافت سے جا کر عزیزہ کی آنکھوں میں جھونک کر، آمنہ کے منہ کی طرف اچھال دی تھی۔دور بیٹھے اونٹ بان ہنس رہے تھے۔عزیزہ ویسے تو کافی سمجھدار تھی لیکن اتنی سی ریت ......بس اتنی سی ریت ......آنکھوں میں اور وہ اندھی ہی ہوگئی ......یہ بھی کوئی بات ہوئی بھلا ......

وہ چلاتی ہوئی، آنکھیں مسلتی ہوئی، جنت کا خون پی جانے کے درپے ہوگئی۔جنت اس سے دور بھاگتی رہی ......یہ بھی کوئی بات ہوئی بھلا......امیر کاروان جن کی خبر گیری کر رہے تھے،ان کی خبر لینا بھول گئے تھے ......واللہ ......اور ان بیماروں کی خبر گیری کرنے واپس پیچھے آئے، جن کے آس پاس بھاگی پھرتی عزیزہ، اپنی آنکھوں کے دشمن کو ڈھونڈ رہی تھی۔ویسے تو امیر کاروان پہلے چڑ گئے تھے لیکن اب انہیں ایک دم سے پیٹ کی خرابی کا ایک ٹوٹکا یاد آ گیا تھا۔وہ اس ٹوٹکے کو اپنے دل میں دبا کر، واپس بیمار کے پاس آئے۔بیمار بے چارا اپنی کہانی پھر سے سنانے لگا، وہ سمجھا امیر نسخہ شفاء لائے ہیں ......ہائے بے چارا ......

امیر بے چارے! کھڑے وہ بیمار کے پاس تھے ......لیکن دیکھ وہ ......دیکھ وہ ......

”کیا آپ بیمار کی طرف دیکھنا بھی پسند کریں گے امیر......؟“

یہ بات کس نے کہی ہوگی بھلا؟ بالکل! اسی اونٹ بان نے جو ایسے ہر موقعے پر امیر کے آس پاس موجود، رہ کر امیر کا دل غریب کیا کرتا ہے۔ہر تیر زہر بجھا ......ہر تیر نشانے پر ......

”تم نے ارادہ باندھ لیا ہے کہ میرے ہاتھوں ہی قتل ہوگے؟“امیر نے اب اس کی گردن پر ہاتھ رکھ ہی دیے تھے۔

”قتل نہیں ......فوت ......امیر! جب انسان دل سے جاتا ہے، تو وہ فوت ہو جاتا ہے۔بے چارا آپ کا دل! کہاں قبر بنوائیں گے اس کی؟ صحرا میں یا ......“

”تمہارے سر میں ......کٹے ہو سر میں ......“امیر نے دانت پیس کر کہا۔

”نکاح کے دو بولوں میں بنوا لیں ......فوت شدہ دل کو، قبول ہے میں دفنا دیں ......“

فوت شدہ دل ......قبول ہے دل ......

امیر کاروان کا دل ......امیر کاروان کا دل ......

☆ ...... ☆ ...... ☆

اس دن کی رات ......کاروان کے ساتھ ان کی آخری رات ......وہ رات رحم دلی سے بے رحمی کے طوفان میں سمٹی تھی۔ان کے کاروان پر بدوؤں کا حملہ ہو چکا تھا۔خاموش کاروان میں ایسی دہائی مچی تھی جیسے دیکھتے ہی دیکھتے، تند ہوائیں وبال مچاتیں، گرج کر آسمان کو کڑکتی بجلیوں کے جال میں بدل دیتی ہیں۔سب تہس نہس کر دیتی ہیں۔یہ حملہ ایسے وارد ہوا تھا، جیسے جنگ وجدل کے میدان میں موت وارد ہوتی ہے۔آخری ہچکی لینے کا موقعہ بھی نہیں ملتا۔سر کٹتا ہے اور دھڑ الگ رہ جاتا ہے ......

کاروان سے آگے ......بہت آگے ......ابن موسیٰ کا تیار کیا محافظوں کا دستہ سفر کر رہا تھا، یہ ان سے ایک دن کے فاصلے سے سفر کر

رہے تھے۔کسی گڑبڑ کی صورت میں، وہ ابن موسیٰ کو خبردار کر سکتے تھے۔کاروان سے مختلف سمتوں میں سفر کرنے والے جاسوس بھی چوکنا تھے۔وہ جانتے تھے کب، کہاں کیسے خبردار کرنا ہے۔آتش گیر مواد آسمان کی سمت بلند کرنا تھا اور پیغام پہنچ جانا تھا۔دن کے پیام رساں پرندے تھے......لیکن نہ آسمان چمکا، نہ پرندہ آیا......نہ ہوا ٹھٹکی، نہ ریت مچلی......ان کا کاروان چلتا رہا، لٹا تو رک گیا۔

بدوؤں کا حملہ ایسے ہوا تھا جیسے وہ کاروان کے راستے کو جانتے تھے، اور ریت کے سمندر میں غار بنا کر بیٹھے ہوئے تھے۔اتنا بڑا کارواں لوٹ رہے تھے، تاریخ پر کچھ حق ان کا بھی بنتا تھا۔صحرا ان کا تھا، صحرا سے باہر والوں سے تاوان جائز تھا۔کاروان کے راہنما ستارے تھے، لیکن بدوؤں کو کوئی اور راہنما بھی میسر تھے۔دفاع پست نہیں کیا گیا تھا، کچل دیا گیا تھا۔بدو، کاروان سے مال سمیٹ رہے تھے۔زخمی امیر منہ کے بل ریت میں گرا تھا، اس کی پشت کو دیو قامت بدو کا جوتا مسل رہا تھا......وہ ہنس بھی تو رہا تھا......

''نکل گیا تمہاری شجاعت کا سارا دم خم......'' ابن منصور نے امیر کاروان کی طرف چلا کر کہا۔ہر حاجی لٹ رہا تھا۔

''کٹوا دی مصر کی ناک، حاجی لٹے پٹے جائیں گے، ہم اپنے تبرکات سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے......عالم اسلام میں سر شرم سے جھک جائے گا......مصر اپنے حاجیوں کی حفاظت نہیں کر سکا، دنیا کو کیا منہ دکھائیں گے۔'' وہ چلا چلا کر پوچھ رہا تھا۔لٹتے ہوئے کاروان میں اس کی آواز جلتی پر تیل تھی۔اپنے اسباب سے ہاتھ دھوتا ہر حاجی، ابن منصور کے لفظوں کے جال میں بڑی جلدی پھنس گیا تھا۔

ابن موسیٰ نے اس جاہل انسان کی طرف افسوس سے دیکھا۔وہ اسے نیچا دکھانے کا یہ موقعہ بھی ہاتھ سے جانے نہیں دے رہا تھا۔سردار بدو نے گردن جھٹک کر ابن منصور کی زبان درازی سے تیخ پا ہوتے امیر کارواں کو دیکھا۔اس لمحے وہ ریت میں دھنسی، امیر کی تلوار کو اپنے ہاتھ میں لے کر تول رہا تھا۔دشمن کا ہتھیار، دشمن سے بڑا دشمن ہوتا ہے، پہلے اس کے بھید لینے چاہیے......

دشمن سے بڑا دشمن......ابن منصور......

''سن لو حاجیوں......اس سب کا ذمہ دار تمہارا یہ امیر کاروان ہے۔اس نے یہ آسمان ہمارے سر پر گرایا ہے......اس نے کاروان میں طوائفوں کو جگہ دی ہے۔جس کاروان کے ساتھ غلاف کعبہ جا رہا ہے، اس کے ساتھ اس نے یہ گستاخی کی ہے......''

سردار ایسی برتری حاصل کر چکا تھا کہ اسے یہ تماشا دیکھنا اچھا لگا۔اس کا دل، دو دل ہو چکا تھا۔فاتح کو کچھ خوشی درکار تھی۔اس نے کاروان ہی نہیں لوٹ لیا تھا، امیر کاروان کی ساری ہستی اجاڑ کر رکھ دی تھی......وہ امیر کاروان تھا......وہ امیر صحرا تھا......اس کا حق بنتا تھا کہ برابری کے اس عہدے کو پوری طرح سے نیست و نابود کر دے۔

''طوائفیں......'' وہ چونک اٹھا تھا......وہ متوجہ ہوا تھا......اسے ایک پرانا حساب بھی تو یاد آیا تھا۔

کاروان کو بدوؤں کے حملے نے اتنا حواس باختہ نہیں کیا تھا جتنا ابن منصور کی تقریر نے کر دیا تھا۔گرم ہوائیں اپنی موجوگی کا پتا جلدی دیتی ہیں۔کاروان کے حاجیوں کے دلوں کی گرمی نے، صحرا کی گرمی کو مات دے دی تھی۔لٹے پٹے مسافر کچھ بے رحم ہو جاتے ہیں۔لٹے پٹے لوگ، وہ تھوڑے سے ظالم ہو جاتے ہیں۔ان کے کشادہ دل ایک دم سے سکڑ گئے۔امیر کاروان نے ان کے ساتھ یہ کیا کیا؟ اس نے ایسی گستاخی کیوں کی؟ ایسا گناہ......ایسی بے حرمتی......امیر کاروان کو خدا پوچھے، اس نے دین پر صرف اپنا حق کیسے سمجھا؟ بھیس بدل بدل

کر اب یہ طوائفیں دین کی بے حرمتی کریں گی۔ اب مذہب کے ساتھ ایسے مذاق کیے جائیں گے۔ قحبہ خانے کے لوگ، اب کاروان حج میں شامل ہوں گے۔ ان کے ساتھ با جماعت نمازیں پڑھیں گے۔ ان کے ساتھ سفر کریں گے اور ان کے برابر کے ''حاجی'' کہلائیں گے...... غلاف کعبہ کو ہاتھ لگا کر، اپنی ناپاک نظروں سے، رب کے گھر کو دیکھیں گے، طواف کریں گے اور ان کے ساتھ کہیں گے...... لبیک...... لبیک...... اے رب لبیک......

''لبیک......'' صحرا نے سرگوشی کی، جسے عزیزہ نے سن لیا اور اس نے جھرجھری لی......

''یہ ان کی نحوست کی وجہ سے ہوا ہے، اگر انہیں جگہ نہ دی جاتی تو...... اللہ نے ہم پر عذاب بھیجا ہے، اس کے گھر کا غلاف لے جاتے ہوئے...... ہم...... ایسا کیسے کر سکتے ہیں......'' کہتے کہتے ابن منصور بلند آواز سے رونے لگا۔ وہ ہچکیاں لینے لگا تھا۔

''کون طوائفیں......''

سردار بدو نے ابن منصور سے بڑے پیار سے پوچھا۔ ایک قحبہ خانے میں کہانی شروع ہوئی تھی، جو اختتام تک نہیں پہنچی تھی۔ وہ نہ سہی تو کوئی اور ہی سہی۔ اس نے اس پر ٹھنڈا مشروب الٹ دیا تھا اور اپنے پاؤں کی ایڑی مارتے ہوئے کہا تھا۔

''میں طوائف ضرور ہوں، لیکن بے غیرت نہیں، اپنے سکے اٹھاؤ اور دفع ہو جاؤ۔ طوائفیں اتنی بھی گری ہوئیں نہیں جتنا تم نے انہیں سمجھ لیا ہے......''

ابن موسیٰ نے دانت پیس کر ابن منصور سے کہا۔ ''تم یقیناً ذلیل و رسوا ہونے والے ہو، بزدل انسان، کچھ خدا کا خوف کرو۔''

''یہ خدا کا خوف بعد میں کر لے گا...... پہلے تم کاروان سے طوائفیں الگ کرو......''

''کاروان میں سب حاجی ہیں......'' ابن موسیٰ بری طرح سے زخمی تھا، لیکن یہ وہ وار تھا جو اس کے دل پر پڑا تھا۔

''حاجیوں میں سے طوائفوں کو الگ کرو......'' اس نے چلا کر کہا۔

''اپنی زبان سنبھال کر......''

''میری تلوار کے نیچے تمہاری شہ رگ ہے اور مجھے زبان سنبھالنے کے لیے کہہ رہے ہو، تمہاری ہمت کی داد دینی پڑے گی۔''

''اپنی بے دینی کو داد دو، حاجیوں کو لوٹ رہے ہو۔'' اس کے سر پر کھڑے بدو کا وزنی پیر اس کی گردن پر وزنی دھکے سے پڑا تھا۔

''کیا تمہیں کسی نے بتایا نہیں کہ چور اور ڈاکو بے دین ہوتے ہیں، چلو تمہیں بتا دیتا ہوں کہ میں اکیلا ہی بے دین نہیں ہوں، سارے بے دین تم اپنے ساتھ مصر سے لے کر چلے ہو۔ ستاروں نے جو راستہ تمہیں دکھانے میں دیر کر دی، وہ ان بے دینوں نے مجھے دکھانے میں دیر نہیں کی۔ چور کے ہاتھ کی کھجلی چلی جاتی ہے، ان جیسوں کے دل کی جلن نہیں جاتی...... تم بچے ہو، ڈاکوؤں سے زیادہ انسان شناس نہیں ہو سکتے۔ جاؤ یہ سبق تمہیں سکھایا، امیر کاروان بنتے ہیں تو صحرا کے ڈاکوؤں سے لڑنے سے پہلے، جماعت کے ڈاکوؤں سے لڑتے ہیں...... آستین کے سانپوں سے...... میرے دفاع میں ڈٹ کر کھڑا ہونے سے پہلے تمہیں ان کے سر کچلنے تھے...... تم نے دیر کر دی امیر...... تم نے کاروان لٹوا دیا......''

دوسری اور آخری قسط

''کیا فائدہ ایسی انسان شناسی کا اگر انسان نے شیطان صفت ہی بننا ہو۔'' ابن موسی کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ کن سانپوں کی بات کر رہا ہے۔ نیک فطرت انسان کا ایک ہی مسئلہ ہوتا ہے، وہ سب کو اپنی طرح کا سمجھتا ہے اور تبھی پیٹھ پر وار کھاتا ہے۔

اس نے قہقہہ لگایا۔ ''حاجیوں کو لوٹنے کا ایک یہ فائدہ ہوتا ہے، سننے کے لیے بہت کچھ مل جاتا ہے، طبیعت باغ باغ ہو جاتی ہے۔''

''حاجیوں کی بد عائیں تمہارے لیے آگ کا انتظام کرتی ہوں گی۔''

''آگ سے کھیلنے والوں کو آگ سے ڈرا رہے ہو...... نادان ہو...... ہم نے دودھ کے دانت کھیل کود میں نہیں توڑے، بچپن ماؤں کی گودوں میں چھپ کر نہیں گزرا۔ کاروان سے طوائفیں الگ ہوں گی یا میرے وار سے ایک ایک حاجی کا سر...... کیا چاہتے ہو؟ صحرا کی پیاس بجھانا......؟ خون سے...... اتنے مہربان نہ بنو امیر!......''

''تمہیں مال اسباب چاہیے تھا، لوٹ لیا......'' ابن موسی نے حتی الامکان اسے طیش میں لانے سے باز رکھا۔ وہ اپنی زبان کو نرم کرنے پر مجبور ہو چکا تھا۔ وہ معاملات کو غیرت سے پرے لے جانے کا پابند ہو چکا تھا۔

''کچھ غیرت ہم میں بھی ہوتی ہے امیر! کچھ عہد ہمارے بھی ہوتے ہیں۔ قاہرہ کی طوائف کے ہاتھ کی ضرب سہی ہے، اس ضرب کا کچھ حساب ہمیں بھی چکا لینے دو۔ میں نہیں جانتا تھا کہ آج صحرا مجھے اتنا کچھ دینے والا ہے۔ وہ میرے سارے حساب بے باق کر دینے والا ہے۔ تم امیر کاروان ہو، میں امیر صحرا...... چلو ایک کو برتری لے جانے دیتے ہیں...... مجھے......'' ابن موسی کی طرف نیچے جھک کر وہ اسے بچوں کی طرح پچکار رہا تھا۔

''تمہارا امیر تمہاری گردنیں کٹوا دینے والا ہے...... وہ طوائفوں کی گردنوں کے بدلے میں تمہیں قربان کرنے والا ہے۔''

ابن منصور عورتوں کی طرح کاروان والوں کی طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کر دہائیاں دے رہا تھا۔ واویلا کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک ایک حاجی اچھی طرح سے یہ منظر دیکھ لے۔ اتنی اچھی طرح سے کہ امیر کاروان کے نصیب میں سزائے موت آئے ورنہ عمر قید۔ مصر کی گلیوں میں اس کا نام خاک آلود ہو، عمر بھر کی کمائی عزت کا جنازہ، ذلت کی کمائی میں بدل جائے۔ سب سن لیں کہ یہ امیر کاروان ہے جس نے سب حاجیوں کو لوٹ کھایا...... یہ وہ ہے جس نے مصر کو عالم اسلام میں شرمسار کروایا...... صرف امیر...... صرف امیر......

ابن موسی ہکا بکا اس تماشہ گر انسان کو دیکھ رہا تھا۔ درویش نے ٹھیک کہا تھا،

''ابن موسی تم نے اتنا نام نہیں کمایا جتنے دشمن کما لیے ہیں۔ مصر کے ایوانوں میں جتنا تمہارے نام کا ڈنکا بجتا ہے، اتنا ہی تمہارے نام کا سانپ دشمنوں کے دلوں پر لوٹتا ہے، چوکنا رہنا...... پیٹھ پر خنجر ہمیشہ قریبی لوگوں نے ہی گھونپے ہیں۔ کاروان کے ساتھ جا رہے ہو تو صحرا کی ہواؤں سے پہلے، جماعت کے بچھوؤں پر نظر رکھنا۔''

جماعت کا سردار بچھو...... امیر کارواں کے عہدے کے لیے تڑپتا ابن منصور...... کاروان میں بھاگا پھرتا طوائف طوائف کر رہا تھا۔

''نکلو باہر...... طوائفوں...... دیکھو تمہاری وجہ سے ہم پر کیسی مصیبت آ پڑی ہے۔ تم نے جرات بھی کیسے کی اس کاروان میں شامل ہونے کی...... تمہارے گناہ، سارا کاروان لے ڈوبا...... ذلیل، کم خصلت عورتوں۔ تمہاری جگہ قحبہ خانہ ہے، کاروان حج نہیں۔''

جنت کا اونٹ عزیزہ کے اونٹ سے کچھ دُور آگے تھے، اس نے سہم کر، سر گھما کر پیچھے عزیزہ کی طرف دیکھا...... مشعلوں کی روشنی ناکافی نہیں تھی، آسمان بھی صاف تھا، چاند بھی روشن تھا...... آگے بیٹھی عزیزہ نے جنت کی بے چین نظروں کو پالیا تھا۔ دل کی دھڑکن سے پہلے اس نے صحرا کی پکار سن لی تھی...... لبیک...... لبیک...... وہ بہری نہیں تھی، جانتی تھی کہ اس کی حاضری آ گئی ہے...... ان کی باری......

صحرا میدان عرفات میں بدلا......

آزمائش کے مزدلفہ میں قیام ''وقوف'' ہوا......

☆ ...... ☆ ...... ☆

ابن منصور انہیں ڈھونڈ رہا تھا۔ ایک ایک اونٹ کے پاس جا رہا تھا، ایک ایک کو دیکھ رہا تھا...... وہ پاگل ہو چکا تھا...... عزیزہ نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسے کاروان حج میں، ہزاروں لوگوں کے سامنے...... درویش اونٹ پر سوار...... خاموش صحرا اور کھلے آسمان کے نیچے...... انہیں طوائف طوائف پکارا جائے گا...... حاجیوں کے کاروان میں، ان کا ماضی انہیں پتھروں کی طرح مارا جائے گا۔

طوائف...... طوائف......

انہیں نام سے نہیں ''گناہ'' سے پکارا جائے گا۔ انہیں انسان نہیں صرف ''طوائف'' سمجھا جائے گا۔

''جو عہد کیے ہیں ان پر قائم رہنا...... مومن بال سے باریک، تلوار سے تیز صراط پر چلتا ہے......''

جو عہد کیے تھے...... وہ عہد نبھانے...... عزیزہ لٹک کر اونٹ سے اتری تھی، اس نے اترنے میں بہت جلدی کی تھی۔ اس سے پہلے کہ ابن منصور انہیں ڈھونڈ لیتا۔ اس سے پہلے کہ وہ ہاتھ کا اشارہ ان کی طرف کر کے انہیں پھر سے طوائف، طوائف کہتا...... اس سے پہلے اس نے اس کا غرور چھین لیا۔ اپنا رتبہ قائم رکھا۔ اپنی بڑائی کو کمتر نہیں ہونے دیا۔ اسے فخر تھا کہ وہ تائب ہو چکی ہے۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی شرمندہ ہونے والی نہیں تھی۔ ساری دنیا ہاتھوں میں پتھر پکڑ لیتی، ساری دنیا مل کر طوائف، طوائف پکارتی، تو بھی وہ اللہ کے رحم پر شک کرنے والی نہیں تھی۔ تو بھی وہ پلٹ کر واپس قحبہ خانے جانے والی نہیں تھی۔ ساری دنیا مل کر انہیں دنیا سے نکال دینے والی تھی تو بھی۔

لٹک کر ہی آمنہ نیچے آ گئی...... لیکن جنت، وہ دل کی کمزور تھی نا...... وہ رو دی تھی۔ اس کے دل سے ایک ایسی درد بھری ٹیس اٹھی کہ وہ درویش اونٹ پر سوار نہ ہوتی، تو اس ٹیس سے ہی مر جاتی۔ وہ سہم گئی، تڑپ اٹھی...... وہ کسی امتحان کے لیے تیار نہیں تھی...... وہ اس تماشتے کے لیے بالکل تیار نہیں تھی...... اس نے گردن موڑ کر خاتون ساس کو دیکھا، اور ان کے سینے سے جا لگی۔

''کاش دنیا یہیں ختم ہو جائے...... سب مر جائیں...... قیامت آ جائے......'' اس نے روتے ہوئے سوچا، انہیں اپنے سینے سے شدت سے بھینچ لیا۔ اس نے ماں نہیں دیکھی تھی، لیکن ماں پا ضرور لی تھی...... پایا تھا، تو بچھڑنا بھی تھا۔

''صبر کرو جنت! ابھی یہ لیٹرے چلے جائیں گے، ہم بہت جلد منزل پر پہنچ جائیں گے۔''

''ابھی تو شروع ہوا ہے خالہ...... سفر......'' اس نے کہا اور اونٹ سے لٹک کر کود گئی۔

دوسری اور آخری قسط

سب سے آگے عزیزہ تھی، وہ اونٹوں، لوگوں، لٹیروں میں سے جگہ بناتی ہوئی ابن موسیٰ کی سمت بڑھ رہی تھی۔ کاروان حج، کاروان صحرا...... کاروان حیات...... کاروان اشک میں بدل چکا تھا۔ عزیزہ کی چال، آمنہ کا افسوس، جنت کی دبی دبی ہچکیاں، ہتھیلی سے گیلی آنکھیں پونچھتیں سسکیاں......

دور قاہرہ میں...... کچی پکی نیند سونے والا درویش...... وہ نم آنکھیں لیے جاگ اٹھا ہوگا۔ تہجد کے لیے اٹھنے کی تیاری کرتی درویش کی زوجہ، وہ ایکدم سے رو دی ہوگی...... درویش کی چھوٹی بچیاں، جوان سے بہت پیار کرتی تھیں، وہ ایک برا خواب دیکھ رہی ہوں گی...... دور...... بہت دور مصر...... جہاں سے حق نکلا تھا...... وہ اس کے نیست و نابود ہو جانے پر سہم گیا ہوگا۔ عاجز اونٹ سر اٹھا کر دیکھے بغیر نہیں رہ سکے...... وہ کلام رکھتے تو کہتے

''عزیزہ...... جاؤ...... تمہارا اللہ نگہبان ہے......''

عزیزہ کو اپنے پیچھے دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی،، وہ جانتی تھی وہ دونوں بھی اس کے ساتھ ساتھ آ رہی ہیں۔ یہ وہی تھی جوان دونوں کو قحبہ خانے سے لے کر نکلی تھی۔ جس نے انہیں کاروان حج میں شامل کروا دیا تھا...... ہاں یہ وہی تھی...... جواب کاروان حج سے باہر ہونے جا رہی تھی...... جرات...... جرات...... سینہ ٹھونک کر کہنا کہ ہاں میں حاضر ہوں...... بولو کون ہو تم؟ میری موت؟ میری مشکل؟ میرا دکھ؟ میری مصیبت...... میری ذلت؟ میں نے کہہ تو دیا کہ میں حاضر ہوں...... آ جاؤ، آگے سے، ورنہ پیچھے سے، ورنہ سامنے سے...... آ گرو، اوپر سے، ورنہ زمین سے پھوٹ نکلو...... میں نے کہہ تو دیا کہ میں حاضر ہوں......

دلوں میں حق کی روشنی اس وقت روح تک پہنچتی ہے جب وہ جرات رکھتی ہے۔ دنیا میں دین حق ''جرات'' سے سر بلند ہوا ہے۔ گھروں میں چھپ کر بیٹھے رہنے سے نہیں۔ دلوں میں سہمے رہنے اور سرگوشیوں میں تبلیغ سے نہیں۔ دین حق کا نام ہے...... کلمہ حق...... یہ جرات سے عام ہوتا ہے، اور جرات سے ہی ''خاص''۔

ابن موسیٰ نے عزیزہ کو آتے دیکھا تو اسے لگا کہ ہاں اب...... اب ایک تنکا بھی اس سے افضل رہا...... وہ خاک سے بدتر...... خاک سے کمتر ہوا......

''میں حاضر ہوں...... عزیزہ...... تمہاری زبان میں ''طوائف''......''

یہ ہمت، یہ حوصلہ صرف وہی دکھا سکتی تھی۔ حق کی روشنی سب سے پہلے اس کے دل پر وارد ہوئی تھی۔ وہ اپنا انجام جان چکی تھی۔ وہ یہ بھی جان چکی تھی کہ جس کی آواز کاروان حج میں گونج رہی تھی، یہ وہی ہے جسے اس نے اپنے پیر سے مسل دیا تھا۔ قحبہ خانے سے اٹھوا کر باہر پھنکوا دیا تھا۔ حبشیوں نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر زمین پر منہ کے بل پٹخ دیا تھا۔

جو چیزیں بکنے کے لیے رکھی جاتی ہیں، ان کی قیمت ہوتی ہے، وہ کتنی بھی معمولی ہوں۔ کسی بھی چیز کی قیمت ''ذلت'' نہیں ہوتی، وہ کتنی بھی کمتر ہوں۔ وہ موت کی سزا کے لیے تیار کھڑا مجرم ہی کیوں نہ ہو...... وہاں ہر جائز ناجائز تھا لیکن حیوانوں کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔ درندوں کے بھی دل ہوتے ہیں۔ کتوں کی بھی کوئی غیرت تو ہوگی۔ عزیزہ نے بھری محفل میں، اس کے منہ پر طمانچہ مارا تھا۔ ٹھنڈے

مشروب کا جام اس پر الٹ دیا تھا۔

"میں طوائف ہوں، مجھے یاد ہے.....تم خریدار ہو، یہ بھی.....میری اوقات کے ساتھ ساتھ اپنی اوقات بھی یاد رکھو۔"" تھپڑ مار کر اس نے جتا کر کہا تھا۔ وہ غصے سے سرخ ہو رہی تھی۔

"تمہیں بھی ماں کی گالی لگتی ہے......" وہ ہنس دیا تھا۔ "مائیں تو شریفوں کی ہوتی ہیں۔"

"ان شریفوں کی جو یہاں آتے ہیں......؟ تمہیں نہیں لگتی؟" وہ اس سے پوچھ رہی تھی۔

جس گالی کے لیے اس نے تھپڑ کھایا تھا، اس سے گندی گالی دے کر اس نے کہا تھا۔ "نہیں......چاہو تو رات بھر دیتی رہو......"

وہ تھپڑ کھا چکا تھا اور ابھی تک اسے اس کی ادا سمجھا تھا۔ وہ اس ضرب کو غیرت میں نہیں بدلنا چاہتا تھا، ورنہ بہت مسئلہ ہو جاتا۔ لیٹرے اتنی غیرتیں نہیں پالتے۔ وہ قافلے لوٹے گا یا اپنی قسموں کی نازبرداریاں کرے گا۔

"تم غلط جگہ آئے ہو......بہتر ہے چلے جاؤ......"

"قحبہ خانے کی اینٹ، عبادت گاہ کا راستہ دکھا رہی ہے؟"

"نہیں......باہر کا راستہ......" کہہ کر، رخ موڑ کر وہ سیڑھیاں اترنے لگی تھی کہ اس نے چلا کر کہا تھا......

"رات ابھی باقی ہے......تمہاری ماں کی شان میں کچھ قصیدے ابھی ادھورے ہیں......سنتی جاؤ......"

اس نے وہیں سے پلٹ کر دیکھا تھا۔ "یہ ادھورے قصیدے پورے کر کے دیکھ لو، زبان گدی کے پیچھے سے نکالوں گی اور اپنی ایڑی سے مسل دوں گی......"

وہ سردار تھا وہ بھی ڈاکوں کا، اسے عادت نہیں تھی عورتوں کی، وہ بھی طوائفوں کی للکار سننے کی۔ کسی دوسرے کے ہاتھ سے مشروب پکڑ کر، اس کے منہ پر انگاروں کی طرح اچھال کر، وہی گالی دی تھی جس پر وہ پہلی بار بھڑکی تھی

"طوائفوں کو، اپنی اوقات پہچاننی چاہیے......ورنہ اپنی حد......" اس رات اس نے کہا تھا۔

عزیزہ نے ایک اشارہ کیا تھا، دیوقامت محافظ نے آ کر اسے پیچھے سے پکڑ لیا تھا۔ اسے منہ کے بل نیچے گرا دیا تھا۔ اس کی گردن پر اس کا وزنی پیر تھا......آگے بڑھ کر عزیزہ نے جوتے سمیت اپنی ایڑی سے اس کا منہ مسل دیا تھا۔

"حیوانوں کے بھی کچھ قاعدے قانون ہوتے ہیں، تم ان سے بھی بدتر ہو......"

حیوان، مہینوں قاہرہ کے اس قحبہ خانے کے چکر لگاتا رہا تھا۔ لیکن جو جگہ جتنی مشہور ہو، وہاں اتنے ہی اثر و رسوخ والے لوگ موجود ہوتے ہیں، جو اپنے دم خم سے کسی کو دم نہیں مارنے دیتے۔ عزیزہ کو شہر سے باہر بھیج دیا گیا تھا۔ زخم پرانے ہو جاتے ہیں، نشان نئے رہتے ہیں۔ غریب کے منہ سے گالی اور ذلیل کے ہاتھ کا طمانچہ نہیں بھولتا۔ اسے یاد رہا تھا......یاد رہا تھا......اپنا منہ ایڑی سے مسلا جانا......یاد رہا تھا......

یاد تازہ ہو گئی تھی......

دوسری اور آخری قسط

بھڑکتی ہوئی مشعل کو جھٹکے سے ہاتھ میں لیا اور اس کے چہرے کے قریب لایا..... وہ اسے دیکھتا رہ گیا تھا..... اور پھر وہ ایسے ہنس دیا جیسے اسے اس سے بڑا خزانہ نہ ملا ہوا۔ وہ اتنی دیر تک قہقہے لگا تا رہا تھا کہ ابن موسیٰ، غیرت سے شرمسار ہو گیا تھا۔ کھینچ کر اس نے اس کی چادر پرے کی تھی۔ اس کے حسن کا چاند ماتم کناں ہو گیا تھا۔ سر کاروان، ذلت کا آغاز ہو گیا تھا۔

''میں ڈاکو ہوں، مجھے یاد ہے..... تم طوائف ہو یہ بھی۔ مجھے تمہاری اوقات یاد ہے، آج تمہیں اپنی اوقات یاد کروانے والا ہوں۔''

عزیزہ خاموش کھڑی تھی..... سارا جہاں خالی تھا..... کہیں کچھ نہیں تھا..... آمنہ، جنت اس کے شانوں کے پیچھے چھپ کر کھڑی تھیں۔ سارا جہاں ''انسان'' تھا۔ ایک وہ اکیلی ''طوائف'' تھیں۔

''تم اس کاروان کے ساتھ جا رہی ہو؟ تم.....؟ قاہرہ کی مشہور طوائفیں حج کے لیے جا رہی ہیں۔ یقیناً زمین پھٹ پڑے گی، یقیناً آسمان آ گرے گا..... کیوں امیر کاروان..... اب تمہارا دین کے بارے میں کیا کہنا ہے؟ تمہارے لیے میں بہت خوار ہوا، اپنا بہت نقصان کیا۔ کسے کسے رشوت نہیں دی کہ تمہیں اٹھا کر میرے سامنے لا کر پٹخ دے، لیکن تمہارا اثر و رسوخ کمال کا تھا۔

ایک قافلے کو لوٹتے ہوئے ایک دیوانہ بار بار بڑبڑا رہا تھا کہ مکافات عمل میری گردن دبوچ لے گا، آج میں مان گیا مکافات عمل کو..... اس نام کی چیزیں واقعی میں ہوتی ہیں..... مکافات عمل..... یہ تمہیں لے ڈوبا.....''

اس نے اس کا پرانا نام لے کر اسے گالی دی تھی۔ وہی گالی، جسے سن کر اس نے اسے تھپڑ مارا تھا، اس کا منہ کچل دیا تھا..... لیکن اب وہ خاموش تھی..... اب وہ بھڑک نہیں رہی تھی۔

''ابن موسیٰ! کاروانوں کو بہت امیر نصیب ہوئے، لیکن تمہاری بات اور تھی..... تمہاری شہرت چار عالم تھی..... میں نے بہت قافلے لوٹے، بہت لوگوں کو مارا، لیکن جو تاوان آج وصول پایا، اس سے پہلے کبھی نہیں پایا..... ہر شے عروج دیکھتی ہے، میں نے اپنا عروج آج دیکھ لیا۔ کیا یاد کرو گے، جاؤ تمہاری جان بخشی کی، ورنہ تمہاری کھال سے جوتے پہنتا..... اس عزت سے تمہارا سر قلم کیا جو کاروان کے امیر کی حیثیت سے تمہارے شانوں پر تھی..... میں نے آج پورا کاروان لوٹ لیا..... کسی کو نہیں چھوڑا.....''

اس رات سارا جہاں لٹ گیا..... کوئی نہیں بچا.....

☆ ...... ☆ ...... ☆

کاروان لٹ چکا تھا..... وہ ریت پر گھٹنوں کے بل گرا رہا، اس نے اٹھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ وہ مرد تھا، چٹان تھا، اب وہ ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔ امیر کاروان! اس کا سارا کاروان لٹ گیا..... کیا بچا اس کے پاس..... امیر کاروان! اس کا حج کہاں رہا اب.....

تینوں جا چکی تھیں.....

اس نے دیکھا کہ صحرا جب خون جذب کرتا ہے، تو کیسا ہولناک ہو جاتا ہے۔ صحرا جب عزتوں کے لٹنے کا گواہ بنتا ہے تو کیسا بے بس ہو جاتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ اس دنیا میں سب سے بڑا ظلم، کسی عورت کی بھرے بازار تذلیل ہے۔ اس نے جانا کہ عورت طوائف ہو یا دین دار..... اس کی عزت..... اس کا احترام دنیا کی ہر روح پر لازم ہے۔ کوئی کتنا ہی گناہ گار کیوں نہ ہو، اس کے عیب پر عرش کے رب نے

پردے ڈال دیے ہوں، تو فرش والوں کا ان پردوں کو اٹھا دینا گناہ کبیرہ ہے۔ وہ گواہ ہوا کہ اس دنیا کی سب سے بدترین چیز ''ظلم'' ہے اور اس دنیا کی سب سے گھٹیا چیز ''بے حسی''۔

''تم نے ان کا نام کیوں لیا۔ تم وحشی انسان ہو۔ تم نے ان کی جانوں پر کتنا ظلم کیا......'' وہ ابن منصور کو چیخ چیخ کر مار رہا تھا۔ وہ اس کا خون پی جانا چاہتا تھا، اس کا گریبان جھنجوڑ رہا تھا۔

''تمہیں عہدے سے برخاست کیا جا چکا ہے ابن موسیٰ!'' کاروان کے اہم ارکان اس کے سر پر کھڑے اسے ابن موسیٰ کے لقب سے بلا رہے تھے۔ یہی تو وہ سب چاہتے تھے۔ امیر کاروان، امیر الحج کو 'ابن موسیٰ' میں بدل دینا۔

''ابن منصور کا گریبان چھوڑ دو، اپنا عہد پورا کرو۔ کاروان کو اس کی منزل تک پہنچاؤ...... یہ کاروان تمہاری وجہ سے لٹا ہے، تم سے مصر واپسی پر بات ہوگی......''

اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر وہ ان کے پیچھے جا رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی......

''تم خدا کو حاضر ناظر جان کر کاروان کی سرپرستی کا حلف لے چکے ہو، تم کاروان کو بیچ راستے میں چھوڑ کر فرشتہ اجل کی پکار کے سوا کہیں نہیں جا سکتے...... ورنہ خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے......''

''ورنہ خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا......'' وہ چلا کر ان سے پوچھ رہا تھا۔ اب لٹے پٹے حاجی امیر کاروان کا نیا روپ دیکھ رہے تھے۔

''خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے تم سب......؟'' وہ چلا کر ان سب سے پوچھ رہا تھا۔ ''کیا منہ دکھاؤ گے...... جواب دو۔''

اس کے سوال کی شدت نے صحرا کا سینہ لرزا دیا تھا اور آمنہ کو ملے کلام حق پر لکھی تحریر کا ایک کلام زندہ ہو گیا تھا اور وہ کہتا تھا۔

''بتا اے انسان...... خدا کو کیا منہ دکھائے گا، اس کی مخلوق کو کمتر پائے گا تو خود کو کیسے معتبر بنا پائے گا؟''

اس کا گھوڑا صحرا میں بل کھا رہا تھا۔ اس نے لٹے پٹے کاروان کو دیکھا...... دیکھا کہ بستیاں، اور بستیاں کیسے اجڑ جاتی ہیں۔ ظلم سے...... ناانصافی سے...... سب حاجی اپنا اسباب سمیٹ رہے تھے، اور تین حاجی اپنا آپ سمیٹ کر جا چکے تھے۔ وہ اس کا سکون، قرار سب ساتھ لے گئے تھے۔ اس نے دیکھا کہ کاروان حج بہت پیچھے رہ گیا ہے...... **لیکن حاجی بہت آگے نکل گئے ہیں......**

تین حاجی......

جنت، آمنہ اور عزیزہ......

☆ ...... ☆ ...... ☆

وہ ان کے گھوڑوں کے ساتھ بندھی ہوئی چل رہی تھیں۔ جیسے کاروان میں اونٹ آگے پیچھے چلتے ہیں، وہ بھی آگے پیچھے چل رہی تھیں...... یہ عہد کا سب سے چھوٹا کاروان حج تھا...... تین حاجیوں کا...... گھسیٹ کر، رینگ کر، چل کر، گر گر کر، اٹھ، اٹھ کر چلنے والا۔

حج کی نیت، حج کا ارادہ، حج سے محبت...... رب کے گھر کی چاہت رکھ کر قدم اٹھانا...... چلنا...... چلتے رہنا...... اعمال کی سرزمین،

امتحان کے آسمان سے نکل کر مرکز کی سمت بڑھنا......ٹوٹ کر، جڑ کر، رو کر قوی ہو کر......بڑھنا اور بڑھتے ہی رہنا۔

یہ دنیا کا سب سے مظلوم کارواں تھا، پھر بھی کیسا چپ تھا۔ کوئی دہائی نہیں تھی، کوئی سسکی، کوئی آہ نہیں تھی۔ انسان کمزور واقع ہوا ہے......وہ بھی کمزور تھیں......لیکن جس وقت عزیزہ بدو کے سامنے جا کر کھڑی ہوئی اور اس نے کہا،

"میں حاضر ہوں......"

اس لمحے انہیں لگا ساری کائنات نے ان کے ساتھ یک زبان ہو کر کہا "لبیک......لبیک......"

جنت جو رو رہی تھی، اس نے بڑی سختی سے اپنے آنسو پونچھ لیے تھے۔ آمنہ جس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں، وہ چٹان ہو گئی۔ انسان بڑا کمزور واقع ہوا......جو کمزوروں میں قوی ہو کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے، اسے چن لیا جاتا ہے......

صحرا کی ریت ان کے قدموں کے نیچے، ان کی زبوں حالی پر ماتم کر رہی تھی۔ سردار بدو، اپنے ٹھکانے پر پہنچ چکا تھا۔ ان کا سفر چور بازار ختم ہوا تھا۔ اس نے انہیں اتنی حیثیت بھی نہیں دی تھی کہ انہیں اپنے چور گھوڑوں کی پیٹھ پر سوار ہونے دیتا۔ اتنی حیثیت بھی نہیں کہ انہیں اپنے چور ہاتھوں سے......اپنے چور جسموں سے......

اور اب وہ چور بازار میں......مشعلوں کی روشنی میں......چبوتروں پر کھڑی ہیں......تینوں......

یہ ان جیسوں کا چور بازار تھا، یہاں چیزیں ارزاں قیمت پر بکتی تھیں......چوروں، لیٹروں کی چیزیں......یہاں نیک، پارسا، عام، خاص سب آجاتے تھے۔ غلیظ، کمینے، حرامی بھی......چور، لٹیرے، آقا، غلام بھی......تین دن تک ان کی بولیاں لگتی رہی تھیں لیکن کوئی بولی ان کی قیمت پر پوری نہیں اتری تھی۔ وہ اپنے حسن میں بامثال تھیں، ان کے اونچے دام لگ رہے تھے اور وہ دور، مردوں کے ہجوم میں بیٹھا ہنس رہا تھا۔ وہ کسی قیمت پر بھی ہاں نہیں کر رہا تھا۔ پہلے اس نے ان کی قیمت چڑھا دی تھی۔ اتنی چڑھا دی تھی کہ وہ وہاں سب کی پہنچ سے باہر ہو چکی تھیں۔ اتنی ہی قیمت جو کسی انسان کی دی ہی نہیں جا سکتی۔ پھر اس نے قیمت گرا دی تھی، اتنی کہ گلی کے مردہ کتے کے بدلے میں بھی انہیں خریدا جا سکتا تھا۔

ان کی غلامی، ان کی بولی، ان کی موجودگی......ہر دن زبان زد عام ہوئی۔ بازار میں بازاریوں کی بہتات خاص ہوئی۔ جو نہیں بھی خریدنا چاہتے تھے وہ بھی محظوظ ہونا چاہتے تھے۔ اتنا حق تو ہر انسان کا بنتا ہے نا......جو محظوظ نہیں ہو رہے تھے وہ بس دیکھ رہے تھے۔ یہ محظوظ ہونے والوں سے بھی بدتر تھے، یہ گونگے تھے......چپ تھے......

جب وہ اچھی طرح سے محظوظ ہو گیا۔ اس کا جی بھر گیا۔ اس کی غیرت کا جام بھر گیا، تو پندرہویں دن اس نے اعلان کیا تھا۔

"آج رات کی بولیاں آخری ہوں گی۔ جو ان کے جتنے گرے ہوئے دام لگائے گا وہ انہیں ساتھ لے جائے گا۔ اتنی گری ہوئی قیمت، جتنی کبھی کسی چیز کی نہ لگی ہو۔ دوبارہ بولی لگانے کی اجازت نہیں ہے......لگاتے جاؤ آگے بڑھتے جاؤ۔"

دنیا میں ان سے زیادہ ارزاں قیمت کسی کی نہیں لگنے والی تھی......دنیا کی ہر چیز گواہ ہو جانے والی تھی......

"میں تمہیں دو کھوٹے سکے دیتا ہوں......"

''کھوٹے ہی سہی، سکے تو ہیں......آگے بڑھو......''اس نے ناں میں سر ہلا دیا تھا۔

''گھوڑے کی نعل......''

''ناں......ناں......مجھے گھوڑے عزیز ہیں......''

ایک ایک کر کے کئی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔ مذاق کتنوں نے کتنی ہی بولیاں لگائیں۔ جو اسے بس اتنی پسند آئیں کہ وہ قہقہوں کے نام ہوئیں۔ بازار میں، بازاریوں کا ریوڑ کھچا کھچ تھا۔ سب کی زبان پر ایک ''مول'' تھا۔

''یہ لو......یہ مجھے گندی نالی میں پڑا ملا ہے......''

ایک بازاری مردہ، بدبودار چوہا لے کر مجمع کے سامنے آیا۔ ناک ڈھانپ کر، دم سے اٹھا کر سب کے سامنے کیا......

''اس سے گری ہوئی قیمت اور کیا ہوگی......''

گرے ہوئے مجمع نے، گرے ہوئے قہقہے لگا دیے......چوہے کو آمنہ پر اچھال دیا......

آمنہ......فروخت اس کے نام ہوئی......

اور پھر جنت......اس کی قیمت، چھڑے کی ٹوٹی ہوئی جوتی قرار پائی......

پیر کی جوتی......پیروں کی خاک کے لیے......جنت کی قیمت......وہ بھی فروخت ہوئی......

''مجھے لفظوں کا جادوگر کہا جاتا ہے، میں کھڑے کھڑے لغت تیار کر لیتا ہوں۔ گری ہوئی یہ گالیاں میں اس کے نام کرتا ہوں۔'' اشارہ کر کے کہا۔ پھر ایک ایک کر کے گالیاں دینی شروع کیں......ہر گالی پر قہقہے گونجے......ہر گالی پر واہ ہوئی......ہر گالی......ہر گالی......

ایک گالی سن کر طمانچہ مارنے والی کی فروخت......ہر گالی کے نام ہوئی......

عزیزہ......وہ فروخت ہوئی......فروخت سر عام ہوئی......

دنیا کے بازار میں، انسانوں کے بھیس میں، حیوانوں کے ہجوم میں، جب کسی انسان کی 'بولی' لگتی ہے، تو وہ گری ہوئی قیمت پر لگتی ہے۔ سب سے ارزاں......وہ اعمال کی نہیں 'اوقات'' کی لگتی ہے......ان کی اوقات کی یہی قیمت تھی......

اور ان کی صراط کی قیمت......وہ تو وہ خود طے کریں گی......

''دنیا میں انسان کی بولی کوڑیوں کے بھاؤ لگے تو وہ جان جائے کہ وہ راہ حق پر ہے......راہ رب پر ہے......

اعمال فروخت نہیں ہوتے......یہ انعام پاتے ہیں، اعزاز، مقام اور 'میرا بندہ'' ......القاب......

(کلام حق)

☆ ...... ☆ ...... ☆

دوسری اور آخری قسط

لٹا پٹا کارواں جیسے ہی اپنی منزل پر پہنچا، ابن موسیٰ نے اپنے گھوڑے کا رخ پھیر لیا۔ استقبال کے لیے کھڑے سرزمین حجاز کے میزبان اس کی شکل دیکھتے رہ گئے تھے۔ کاروان کے ساتھ جو گزری تھی، ان تک خبریں پہنچ چکی تھیں۔

''تمہاری سزا ابھی طے ہونی ہے ابن موسیٰ! اتنی جلدی نہ کرو بھاگنے میں، تمہیں ایک ایک حاجی کے جان و مال کا حساب دینا ہے۔''

''میں اپنا عہد پورا کر چکا ہوں، کاروان منزل پر پہنچ چکا ہے۔ میری سزا وہ ہیں جو کاروان سے الگ جا چکی ہیں۔''

''حج نہیں کرو گے......''ابن منصور نے طنزیہ کہا۔

''حاجیوں کے بغیر حج کیسے کرلوں......''اس نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی تھی۔

وہ جانتا تھا کہ یہ اب ممکن نہیں رہا کہ جو جا چکی تھیں انہیں ڈھونڈ نکالا جائے......اس لیے......اس نے ان کے پیچھے خود کو بھی گم ہو جانے دیا۔ وہ امیر کاروان تھا......اور امیر......اپنے کارواں کے جانوروں تک کا خیال رکھتے ہیں، وہ تو پھر ''انسان'' تھیں۔ وہ امیر الحج تھا، اور وہ مسافر حج......

☆ ...... ☆ ...... ☆

انسانوں کے ہجوم میں، حیوانوں کے بازار میں، وہ کئی ہاتھوں سے ہوتی ہوئی، بھاگی ہوئی، لٹی ہوئی، یہاں آئی تھی۔ اسے ارزاں قیمت پر خرید کر، دوسری، تیسری، چوتھی جگہ بیچ کر، اس جگہ رشتہ داری نبھانے کے لیے بھیج دیا گیا تھا۔ بڑی عمر کی وہ عورت وقت سے پہلے ضعیف ہو چکی تھی۔ نابینا اور بیمار تھی۔ مرحومہ بیٹی کی بچی کے لیے ایک خادمہ چاہتی تھی۔

''کیا نام ہے تمہارا......''

اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر وہ پوچھ رہی تھیں۔ گیارہ مہینوں میں......اب......اب کسی انسان کی آواز سنی تھی۔ کسی نے انسان بن کر بات کی تھی......جواب دینے کی بجائے آمنہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

''آمنہ......آمنہ''وہ ہچکیاں لے رہی تھی۔ اسے اب یاد آیا تھا کہ وہ آمنہ ہے۔ وہ بھی تو انسان ہے۔

''آمنہ......میری بیٹی کبریٰ بھی تم جیسی تھی......ایسی ہی معصوم صورت، ایسی ہی بات بات پر رو دینے والی۔''

وہ اس کے چہرے پر اپنا ہاتھ پھیر رہی تھیں۔

''نابینا لوگوں کو سب دکھائی دیتا ہے آمنہ! بس چپ ہو جاؤ، رونا بند کرو......دیکھو اللہ نے میری سن لی، خدمت کے لیے لوگ تو بہت مل رہے تھے لیکن ''ماں'' نہیں مل رہی تھی۔ چچا زاد بھائی کی بہت منتیں کیں کہ کوئی اچھی سی ''ماں'' لا دو۔ سب کہتے ہیں میں پاگل ہوں۔ میں نے کہا کہ بس مجھے مجھ جیسی پاگل لا دو......دیکھو کیا میں پاگل ہوں۔ کیا بوڑھا اور نابینا ہو جانا، انسان سے انسان ہونا چھین لیتا ہے۔ اس کا نعمتوں پر حق نہیں رہتا، اسے بس ''موت'' کے لائق سمجھا جاتا ہے۔ اپنے پیچھے کبریٰ اپنا جگر گوشہ چھوڑ گئی ہے، میں نابینا نہ ہوتی تو بہت کچھ کر لیتی......اب سب تم کرنا......''

بستر پر بیماروں کی طرح پڑی، ڈیڑھ سال کی کمزور ناتواں سی بچی کو گود میں اٹھا کر اس نے سینے سے لگالیا۔ وہ اپنے آپ سے بچھڑ گئی تھی ......اب ملی تھی...... اتنی بے رحمی دیکھ لی تھی کہ لگتا تھا اپنے اندر سے بھی رحم مٹ گیا ہے۔ لیکن اس کے سینے میں دھڑکتے دل میں، مرحومہ ماں کی ایک دھڑکن زندہ تھی۔ بچی کو سینے سے لگایا تو اس نے اپنے اندر رحم کے سمندر کو ٹھاٹھیں مارتے محسوس کیا۔ جیسے وہ بچی ہمیشہ سے اس کی تھی۔ اس نے یہ سفر اس بچی کے لیے ہی کیا تھا۔

''کیا نام ہے اس کا......'' وہ بچی کے ہاتھ سے اپنے گیلے گال پونچھ رہی تھی۔ اسے بہت سکون مل رہا تھا۔

''کسوہ...... پتا نہیں کبری کو کیسے خبر ہوگئی تھی کہ بیٹی ہی ہوگی، نو مہینے کسوہ کہہ کر اسے بلاتی رہی تھی۔''

''کسوہ......؟'' وہ زیر لب بڑبڑائی...... ''کسوہ الکعبہ......'' زیر دل دہرایا۔

کہانی وہاں سے ہی تو شروع ہوئی تھی......

کسوہ......یہ اس عورت کی بیٹی تھی جو حافظ قرآن تھی۔ جس نے خواب دیکھا تھا کہ وہ اپنی اولاد کو حافظ قرآن بنا کر اس مدرسے میں بھیجے گی، جہاں بچیاں کسوہ الکعبہ کی تیاری میں حصہ لیتے ہیں۔ جہاں غلاف کعبہ تیار ہوتا ہے۔ ماں نے نو مہینے ہر سانس قرآن کی آیتیں پڑھی تھیں۔ ماں نے پہلے لمحے سے اولاد کے لیے تیاری شروع کردی تھی......وہ ماں جا چکی تھی، جو ماں اسے اب ملی تھی......وہ......وہ......وہ حافظ قرآن تو نہیں تھی......وہ تو......وہ تو......

☆ ...... ☆ ...... ☆

وہ شہر سے دُور......بہت دُور......قبرستان جیسے ویران میدان میں بنے اس کوٹھری نما گھر میں بیٹھی ہوئی ہے۔ یہاں چند اور لوگ موجود ہیں۔ جنہوں نے اپنے ناک ہاتھ سے، ورنہ کپڑے سے ڈھانپ رکھے ہیں۔ صرف وہ اکیلی ایسی ہے جس نے یہ تردد نہیں کیا۔ وہ اسے اپنے بھائی کے لیے لایا تھا۔ جو ایسی بیماری میں مبتلا تھا، جس نے اسے آبادی سے دور سے پھینکنے پر مجبور کردیا تھا۔ پہلے لوگوں کا ماننا تھا کہ یہ کوڑھ ہے، لیکن طبیب نے کہا یہ کوڑھ نہیں لیکن اس سے بہتر بھی نہیں۔ وہ وبائی مرض نہیں تھا لیکن لوگ سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس کے سوتیلے بھائی نے اسے اس ویرانے میں پھینک دیا تھا۔ اس کے سارے جسم پر بلبلوں جیسے زخم تھے، ان میں خون آلود پیپ تھی۔

وہ چلنے پھرنے سے عاجز تھا۔ تین وقت کا کھانا اس کے پاس اس ویرانے میں لانا، ایسا جوئے شیر تھا جس کے لیے ملازم رکھا ہوا تھا۔ لیکن کوئی بھی ملازم، معمولی سے معمولی انسان بھی، اس کی دیکھ بھال کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ اس کی بیماری سے خوفزدہ تھے۔ اس کے پاس ایک لمحہ کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا۔ بازار میں بکنے والی ارزاں جنت کو وہ اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ وہ خصلت میں کمینہ نہیں تھا لیکن جب بازار لگا ہو......ان جیسیوں کی بولیاں دی جارہی ہوں......تو پھر......بہت سوں کے اندر کی خباثت باہر نکل آتی ہے۔ چیزیں مفت مل رہی ہوں تو جن کے پیٹ بھرے ہوئے ہوتے ہیں وہ بھی انہیں لینے کے لیے دوڑ پڑتے ہیں۔ بھلا انسان کی لالچ کا بھی کہیں خاتمہ ہے؟ جس نے اسے وصول پایا تھا وہ اسے گھسیٹ کر اپنے ٹھکانے کی طرف لے جارہا تھا۔ اس نے اس کا پیچھا کیا اور اس کے آگے چند سکے پھینک

دیے تھے۔

''انہیں اٹھاؤ......اور اسے چھوڑ کر دفع ہو جاؤ......''

اس نے سکے اٹھائے ،نہ دفع ہوا، الٹا وہ تمسخر سے ہنس دیا تو اس نے اپنے خادم کو اشارہ کیا اور اس نے ایک پتھر اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا......بس......

''تمہاری عزت بچائی ہے......اب اپنی جان بچانا چاہتی ہو تو چپ چاپ میرے ساتھ چلو۔''

عزت بچانے والا اس کی جان خرید رہا تھا۔وہ چپ چاپ نہ بھی ہوتی تو کیا اس سے جیت جاتی۔وہ دنیا کے کسی بھی انسان سے جیت جاتی کیا؟اس کا ایمان چٹان تھا لیکن جسم تو بھر بھری مٹی ہی تھا نا۔کوئی بھی چیر پھاڑ کر لیتا۔کوئی بھی گھسیٹ کر، کہیں بھی لے جاتا۔

''تمہیں حنان مراد کے ساتھ نکاح قبول ہے......؟''

اس سے پوچھا جا رہا تھا......سوال اس سے کیا جاتا ہے، جس کے پاس جواب دینے کی گنجائش رہنے دی گئی ہو۔اس کی آنکھوں کے پپوٹوں تک پر زخم تھے۔اس کے قریب کھڑے ہونا ایسا ہی تھا جیسے اپنا دم گھوٹ لینا۔اس نے سر اٹھایا، آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں، ہونٹ کانپ رہے تھے، اس کا جی چاہا وہ بھاگ جائے، اس کا جی چاہا اسے موت آ لے، اس کا جی چاہا......کیسے اس کا جی پھٹا جاتا تھا......

''اپنی ساس کے دل پر پڑھ پڑھ کر پھونکا کرو، دل بدل جائے گا ان کا۔''عزیزہ کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

''تمہیں یہ نکاح قبول ہے......؟''

''ہم میں سے کسی ایک کا بھی نکاح ہو گیا تو ہم تینوں معتبر ہو جائیں گی......''

''تمہیں یہ نکاح قبول ہے؟''

''یہ جنت ہے......اس جیسی ڈرپوک لڑکی پورے مصر میں نہیں ملے گی......''

قبول ہے......قبول ہے......قبول ہے......؟

اس نے اپنی آنکھیں رگڑیں، بستر پر پڑے اس مرد کو ایک نظر دیکھا......دنیا جہان کی ڈرپوک لڑکی نے......

''میں موجود ہوں......''وہ صاحب چاہت تھی نا......اب وہ صاحب لبیک تھی......

اس کی آواز پر سب نے سر اٹھا کر دیکھا، کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی تھی......

''میں حاضر ہوں......حاضر ہوں......جنت حاضر ہے اے رب!''

ہاں وہ حاضر تھی، زندگی کا ہر تلخ جام پینے کے لیے۔وہ حاضر تھی، ایک ایسے بیمار کی بیوی بننے کے لیے، جسے اس کے سگے، سوتیلے رشتوں نے اٹھا کر بستی سے باہر پھینک دیا تھا۔لیکن رضا کا یہ گھونٹ پیتے پیتے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی......انسان کمزور ہے نا......

☆ ...... ☆ ...... ☆

یہاں پہاڑ ہیں ، دلدل ہے، جنگل ہے......گھنا جنگل ہے......ڈراونا جنگل ہے......یہ گیلا جنگل......یہ درندہ

جنگل......

یہ غلام جنگل ہے...... یہ آقا جنگل ہے...... اس جنگل کی نیم دلدلی زمین میں، درختوں کی جڑوں کو کھود کر وہ کچھ ڈھونڈ رہی ہے۔ ہر وہ چیز جو دولت میں شمار ہوتی ہے۔ موتی، ہیرے، سونا، چاندی، جواہر......

یہ عزیزہ ہے......

وہ ان تیس لوگوں میں سے ایک ہے، جنہیں طون نے اپنا غلام بنالیا ہے۔ اس کے آدمی بدزمانہ منڈیوں سے اس جیسے غلام خرید کر لاتے ہیں جن کے آگے پیچھے کوئی نہیں ہوتا۔ جو کوڑیوں کے مول فروخت ہوتے ہیں۔ یہ تیس غلام نوعمر بچیاں ہیں، کچھ بڑی عمر کی عورتیں، چند ضعیف عورتیں اور ایک وہ ہے۔ وہ زمانہ عالمیت سے، زمانہ غلامیت کے وقت میں آچکی تھی۔ بدترین غلاموں میں......

طون...... وہ بدترین آقا تھا......

وہ اب تک اپنی پشت پر کتنے ہی کوڑے کھا چکی تھی۔ چور بازار میں گالیوں کے مول بکنے والی، جنگل میں ہیرے موتی ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ زمین کی جنت سے خزانہ تلاش کر رہی تھی۔ کبھی یہ جنگل ڈاکوؤں کا مسکن ہوا کرتا تھا۔ وہ اتنے مشہور اور نڈر ڈاکو تھے، کہ انہوں نے کئی سوشاہی قافلے لوٹ کر ان کے خزانے جنگل کو ہضم کروا دیے تھے۔ انہوں نے بحری قزاق تک نہیں چھوڑے تھے۔ مشہور تھا کہ ہولناک زلزلے نے ان کا مسکن، گہری اندھیری غار کو پورا کا پورا زمین میں دھنسا دیا تھا۔ سب زندہ دفن ہو گئے تھے۔ بہت لوگ اس خزانے کی تلاش میں آئے تھے، جو ڈاکو اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ کچھ کے ہاتھ وہ آیا تھا، کچھ دلدلی زمینوں سے اپنی زندگی کو موت دے کر کبھی نہیں لوٹے تھے۔ کچھ ہمت ہار گئے تھے...... لیکن ایک...... وہ سب پر بازی لے گیا تھا۔ اس نے غلاموں کی فوج اکھٹی کر لی تھی۔ وہ منڈیوں سے اپنے مطلب کے غلام خریدتا تھا اور انہیں درختوں کی جڑوں، غاروں کے اندھیروں، دلدلوں کی تہوں، جھاڑیوں کی جھنڈوں میں خزانے کی تلاش پر لگا دیتا تھا...... صرف بچیاں، عورتیں، لڑکیاں...... جو جنگل سے فرار نہ ہو سکیں۔ اس کا ماننا تھا کہ پورا جنگل، ہر درخت، ہر دلدل کی تہہ، اس خزانے کا لقمہ کھائے ہوئے ہے۔ اسے اب ان کے پیٹ سے وہ سب نکالنا تھا...... سکے اور ظروف...... سونا، چاندی، ہیرا، موتی......اور عزیزہ......

ہیرا...... زمین کے ہیروں کی تلاش میں تھا......

جو سرراہ لوٹ لیتے ہیں وہ ڈاکو ہوتے ہیں، جو زمین کے خزانوں کو اپنا پیٹ بھرنے کے لیے کھوجتے ہیں، وہ چور ہوتے ہیں...... زمین کا چور...... زمین کے سینے میں جو کچھ ہے، وہ زمین پر موجود ہر انسان کا ہے۔ خزانے کسی ایک کے نہیں ہوتے، اگر ایک کے ہوں تو پھر ہڑپ کر لینے والے فرعون ہوتے ہیں۔ یہ فرعون پھر غرقاب ہوتے ہیں۔

وہ فرعون ہی تھا، سب غلام اسے ''طون'' کہتے تھے۔ وہ فرعون اور طاعون کی خصوصیت کے اس نام سے واقف تھا لیکن اسے اس نام پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ آقاؤں کے بہت سے نام ہوتے ہیں۔ غلام کا بس ایک نام ہوتا ہے، ''غلام''۔ روشنی کی پہلی کرن کے ساتھ انہیں جنگل کی طرف ہانک دیا جاتا تھا۔ وہ زمین کھودتے تھے...... نہیں...... وہ زمین ایسے نہیں کھودی جاتی سکتی تھی جیسے پانی کے لیے کنوئیں

کی، مردے کے لیے قبر کی، بیج کے لیے فصل کی......

وہ گیلی، دلدلی، کٹیلی، زہریلی زمین ہاتھوں سے کھودی جاتی تھی، جیسے ریت سے بال تلاش کیا جاتا ہے، جیسے سمندر سے آنسو، جیسے جنگل سے پتنگا...... زلزلے نے اتنے بڑے گروہ کے ڈاکوؤں کے خزانے کو دانوں کی طرح جنگل میں بکھیر دیا تھا، یہ اس کا ماننا تھا۔ وہ گیلی مٹی کے سینے میں تھا، جسے ہاتھ سے مسل مسل کر نکالنا تھا۔ وہ کیچڑ، دلدلی زمینوں میں تھا۔ کسی ہیرے کو خراش نہیں آنی چاہیے۔ اس کی قیمت کم نہیں ہونی چاہیے۔ سکوں کو، موتیوں کو...... ظروف کو...... اِسے...... اُسے...... ہر چیز کو...... ارزاں...... قیمتی...... سب کو۔

انسان نے ہمیشہ کم قیمت چیزوں پر ہاتھ ڈالا ہے...... ہیرے جواہر پر...... اپنی قیمت بھلا کر اس نے پتھروں کو قیمتی بنایا ہے۔ جنگل سے وہ خزانہ قطرہ قطرہ نچوڑ رہے تھے۔ نگرانی کے لیے چار دیو قامت حبشی تھے۔ وہ کوڑے لے کر ان کے سروں پر سوار رہتے تھے۔ نہ بھی سوار رہتے تھے تو اس گھنے جنگل سے کوئی باہر نہیں نکل سکتا تھا...... وہ اتنا گھنا جنگل تھا...... اتنا گھنا کہ ساری زندگی اس میں گزار کر بھی انسان راستہ نہیں پا سکتا تھا......

طون کو ہیرے، موتی چاہیے تھے۔ وہ تلاش کرنے والے اپنی دعاؤں سے نکالتے یا اپنے خون سے۔ وہ معجزے کرتے یا جادو۔ ورنہ وہ غصے سے دیوانہ ہو جاتا تھا۔ وہ تیس غلام...... کسی کے مر، مرا جانے کی صورت میں ستائیں، اٹھائیس غلام۔ نئے غلاموں کی آمد پر تیس پینتیس جانور......

اسی جنگل میں بنے اندھیرے غار ان کے ٹھکانے تھے...... دن مشقت بھرے تھے...... راتیں سسکیوں بھریں...... جس دن ایک بھی موتی نہیں ملتا تھا، اس رات بھوک ملتی تھی، اس رات کوڑے ملتے تھے۔ اس رات کسی نہ کسی کی انگلی کٹی ملتی تھی۔

وہ ایک ایک جوڑ سے انگلی کاٹتا تھا۔ ہاتھوں کی، پیروں کی...... بچیوں تک کی دو، دو تین، تین انگلیاں کٹی ہوئی تھیں۔ اپنی غلامی کے پندرہویں دن اسے ایک درخت کی جڑ کھودتے ہوئے، ایک عمر رسیدہ پوٹلی ملی تھی۔ ابھی وہ اس کے ہاتھ میں آئی ہی تھی کہ پیچھے سے اچک لی گئی تھی۔ رات کے کھانے میں دو نوالے زیادہ ملے تھے۔ پتھریلی زمین پر سوکھی گھاس کا بستر میسر آیا تھا۔ وہ موتیوں سے بھری ایک پوٹلی کھوج نکالنے میں کامیاب ہو چکی تھی، ایسا اس نے نہیں کیا تھا، ایسا اس کے نصیب کے ہاتھوں ہوا تھا۔ وہ تو بس...... انگلیاں بچا ہی تھی...... سسکیاں خرید رہی تھی...... تکلیفوں کی راحت ڈھونڈ رہی تھی......

''ہم چھ مہینے سے اس جنگل میں چوہوں کی طرح درختوں کی جڑیں کھود رہے ہیں، ہمارے ہاتھ چند موتیوں کے سوا کچھ نہیں آیا، تم نے بڑا معرکہ مارا ہے......'' بچیاں خوش تھیں کہ آج کی رات کوئی رو کر نہیں سوئے گا۔ کوئی تڑپے اور سسکے گا نہیں۔

''کیا پڑھ کر زمین کو کھودا تھا؟'' ایک نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

''تمہاری جانوں پر کوئی آنچ نہ آئے...... یہ نیت رکھ کر کھودا تھا......''

وہ افسردہ ہو گئی۔ جس کی اپنی قیمت گالیاں تھیں، وہ بیش قیمت موتی ڈھونڈ چکی تھی۔ یہ وہ جواہر تھے جو وہ اپنے پیچھے بڑے شوق سے چھوڑ آئی تھی۔ ایک بار پلٹ کر ان کی طرف نہیں دیکھا تھا...... لیکن ہاں...... جب لٹانے والے اس کے حسن پر لٹاتے تھے تو اس نے سوچا تھا

کہ اس کے حسن کے پلڑے میں ہر خزانہ بے وزن ہے۔ زمین خالی ہو جائے گی ،لیکن اس کی قیمت نہیں چکا پائے گی......

زمین اس کے تکبر کی قیمت ،اس کی ہتھیلیوں سے چکوا رہی تھی۔ وہ اس سے پوچھ رہی تھی کہ حسن اگر ایسا ہی کارگر ہتھیار ہے تو پھر یہ کند کیسے ہوا......تمہاری پیٹھ پر کوڑا کیوں پڑا؟ تمہارا مول کھرا کیوں نہ لگا......تکبر......رائی کے دانے برابر، یہ زمین پر بڑا بھاری ہے۔ یہ روح پر بڑا کرب ہے......

''دکھائی دینے والی ہر چیز کم حیثیت ہے۔ حیثیت والی سب چیزیں 'پوشیدہ'' ہیں، ''باپردہ'' ہیں۔'' (کلام حق)

''تم نے کمال کر دیا......یہ بتاؤ تم نے کیسے نکالا......''طون پوچھ رہا تھا، تا کہ انہی خطوط پر باقیوں سے کام کروائے۔

''زمین کو جس نیت سے ہاتھ لگایا جاتا ہے، یہ ویسی ہی ہو جاتی ہے۔ قبر کھودنے کے لیے تو قبر کھود دیتی ہے۔ کنوئیں کے لیے تو پانی دے دیتی ہے۔ رزق کے لیے تو پھل، پھول، فصل سب دے دیتی ہے۔ خزانے کے لیے تو خزانہ دے دیتی ہے۔ میں نے ضعیف عورتوں کی جان کو تکلیف سے بچانے کے لیے کھودا تھا اور......''

اس نے بہت سکون سے اپنی نیت، اپنی مشقت کی حقیقت بیان کی تھی۔ وہ اسے بتا رہی تھی کہ میں تمہارے لیے خزانہ نہیں، انسانوں کے لیے راحت کے کچھ لمحے ڈھونڈ رہی ہوں۔ میں اکیلی ہوتی تو تم میرا سر ہی کیوں نہ کچل دیتے، میں تمہاری لالچ کا پیٹ نہ بھرتی......

''مجھے نہیں پتا تھا کہ میرے غلام ایک درویش خرید لائے ہیں......تم تو طوائف نہیں ہو؟''

''سارا جہاں یہ یاد رکھے گا کہ میں طوائف ہوں، تم بھی یاد رکھو......بھلا مجھے تم جیسے انسانوں کی پرواہ ہی کہاں ہے۔''

اس نے بڑی بے نیازی سے کہا۔ اس جنگل میں قید ہو کر بھی وہ ڈرتی نہیں تھی۔ اسے کسی شے کی پرواہ نہیں تھی۔ تب بھی جب اس کی بولی لگائی جا رہی تھی۔ بھلا حیوانوں کی منڈیوں میں ''انسان'' کی بولی لگائی جا سکتی ہے۔ وہ اپنے دل میں پشیمانی کی کوئی بھی گرہ لگانے والی نہیں تھی۔ وہ دین حق پر، ایمان حق قائم کر چکی تھی۔ شہادت دے چکی تھی۔ اب بھلا دنیا ہاتھوں میں پتھر تھام لیتی یا پھر زبان پر گالی لے آتی......وہ بے نیاز تھی......

''لیکن تم لاپرواہ نہ ہونا......اب تم ہر روز زمین کو اس نیت سے ہاتھ لگاؤں گی کہ اگر مجھے کچھ نہ ملا تو ان غلاموں میں سے کسی ایک کی انگلی کٹے گی......ہر روز کٹے گی......میں نے انسانوں سے بہت کام لیے ہیں، اب میں ایک اللہ والے سے کام لوں گا......کل صبح تیار رہنا......آج رات دعا مانگ کر سونا، گڑگڑا کر......میں پیٹ بھرے بغیر رہ سکتا ہوں، خزانے کا صندوق بھرے بغیر نہیں۔''

''روح کو جس نیت سے جھنجھوڑا جائے، وہ اس نیت پر عمل پذیر ہو جاتی ہے۔ روح، یہ ایسی فرمانبردار ہے۔

عمل......اس کا نیت پر ہی تو دارومدار ہے......'' (کلام حق)

☆ ...... ☆ ...... ☆

یہ غیر تراشیدہ پتھروں سے بنا ایک غار نما کمرہ تھا۔ کونے میں پانی کی صراحی رکھی تھی اور دوسرے کونے میں مراد کا بستر تھا۔ کمرے میں کھڑکی نہیں تھی کیونکہ وہ ہوا برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ روشنی بھی اسے تکلیف دیتی تھی۔ چراغ کی روشنی بھی حرام تھی۔ اس گھر کو......اگر گھر

کہنا جائز ہے تو کے باہر جہاں تک نظر جاتی تھی وہاں ٹیلے اور میدان تھے ......دور ...... بہت دور ...... درختوں کے جھنڈ دکھائی دیتے تھے......ان تک چل کر جانے میں اتنا وقت لگتا تھا کہ واپسی پر انسان تھکن سے ہانپ جاتا تھا۔ اسے ہر روز صبح اس جھنڈ تک جانا ہوتا تھا۔ وہاں ایک درخت تھا جس کے تازہ سبز پتے توڑ کر، پانی میں ابال کر مراد کے زخم دھونے ہوتے تھے ......صبح وشام ......

نکاح کے بعد اس نے سب سے پہلے یہ کام کیا تھا۔ اپنی چادر الٹ کر ...... اپنی شرم، اپنا لحاظ پرے رکھ کر ...... مراد کے بھائی کی بیوی نے اسے راستہ دکھا دیا تھا۔ نئی نویلی دلہن نے وہ راستہ دیکھ لیا تھا، اور اسی وقت چل کر اتنی دور تک گئی تھی۔ کاروان حج سے باہر ہونے کے بعد، چور بازار میں فروخت ہونے کے بعد، اس کے پیروں میں چھالے نہیں پڑتے تھے۔ اس کے ہاتھ مشقت کرتے تھکتے نہیں تھے......لیکن ...... ڈور پیدل چل کر جاتے ہوئے ...... مطلوبہ درخت کو ڈھونڈتے ہوئے ...... پتے توڑتے ...... چل کر واپس آتے ......لکڑیاں، اکٹھی کر کے آگ دہکاتے، پانی بھرتے ...... بڑے برتن میں پتے ابالتے ......اور پھر زخموں کو دھوتے ہوئے وہ رو دی ......وہ رو دی ......

وہ خود بھی خوبصورت تھی اور خوبصورتی کو پسند بھی کرتی تھی۔ وہ اس جیسے بیمار، زخم خوردہ انسان کو اپنا شوہر بنے دیکھ کر، اپنے دل کے کاروان کا سوار کھول بیٹھی تھی۔ وہ اس جیسے انسان کی بیوی بننے کی تمنائی تو کبھی نہیں رہی تھی۔ جو چیز انسان خواب میں بھی نہیں سوچتا، وہی کیوں حقیقت بن کر سامنے آجاتی ہیں۔

جنت ......وہ ایک دن کی دلہن تھی۔ جنت ...... وہ زندگی کو بہار کے ساتھ یاد رکھتی تھی۔ قحبہ خانے میں رہتے ہوئے بھی وہ نکاح کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ وہ سوچا کرتی تھی کہ کبھی، کوئی اتنی وفا ضرور دکھائے گا کہ وہ اس کے لیے ساری دنیا چھوڑ دے گی۔ پھر اسے معلوم ہوا، سب کچھ انسانوں کے لیے نہیں، خدا کے لیے چھوڑا جاتا ہے، اور اس نے ایسا کیا ......لیکن اب وہ رو رہی تھی ...... اس کا دل بھاری تھا۔

اور وہ بھی رو رہا تھا ......اس کی زبان تک پر زخم تھے ...... بولنے میں اسے کتنی تکلیف ہوتی تھی۔

"مجھے معاف کر دو، میں خود غرض ہو گیا تھا۔ لیکن میں کیا کروں، میں اٹھ نہیں سکتا، چل نہیں سکتا ...... کھا نہیں سکتا، کما نہیں سکتا ...... میں بستر پر پڑا اپنی موت کا انتظار کر رہا ہوں۔ خود کو ختم بھی نہیں کر سکتا ...... یتیم اور مسکین ہوں، سوتیلے بھائی نے اتنا بھی کر دیا بہت ہے۔ لیکن زندگی ایسی بھی مجبوری نہیں کہ اسے تم جیسی پھول لڑکی پر ظلم کر کے ظالم بنا لیا جائے۔ جاؤ ...... میری طرف سے اجازت ہے ...... جاؤ ...... میں تمہیں آزاد ......"

"کہاں چلی جاؤں ......؟" وہ حیران اس بیمار کو دیکھ رہی تھی، جو آج ہی اس کا شوہر بنا تھا۔

"جہاں سے آئی ہو ......"

"میں طوائف رہی ہوں۔ کاروان حج کے ساتھ جا رہی تھی، پھر فروخت ہو گئی ......" کہتے کہتے وہ پھر سے رو دی۔

"تم طوائف نہیں فرشتہ ہو جنت! بھلا مجھ جیسے بے بس لوگوں کی مدد کے لیے فرشتوں کے علاوہ کسے بھیجا جاتا ہے۔"

وہ سارا جہاں اس بات کو سن کر بھول گئی تھی "کیا کہا ......؟"

''تم فرشتہ ہو جنت !تم نے اپنا سانس نہیں روکا، ناک پر ہاتھ نہیں رکھا، منہ نہیں بنایا۔تم نے میرے زخموں کو ایسے صاف کیا...... ایسے......ایسے کہ......'' وہ پھر سے رو دیا۔کتنی شرم سے رو رہا تھا۔

جنت نے طوائف ،طوائف ،طوائف کے بعد پہلی بار اپنے لیے ''فرشتہ'' لفظ سنا تھا۔اس نے پہلی بار زمین کے کسی انسان سے اپنے لیے ''آسمانی'' لفظ سنا تھا۔درویش کے بعد وہ پہلا انسان تھا جو اس کی حقیقت جان لینے پر بھی اس سے نفرت یا ناپسندیدگی سے مخاطب نہیں ہوا تھا۔تو کیا جو لوگ تکلیف سہتے ان کے دل کشادہ ہو جاتے ہیں۔جو خود کانٹوں کے بستر پر ہوتے ہیں وہ دوسروں کو کانٹے چبھونا بند کر دیتے ہیں۔اس کے آنسو ایکدم سے تھم گئے۔اس کے دل کا بوجھ ڈھل گیا تھا۔

''میرا سارا اسباب تو لینے والوں نے لے لیا،اب میری کل متاع میری بیماری ہے......اور تم......''

''اور تم......کل متاع......''وہ کس مول پر بکی تھی،اب وہ کہتا تھا''متاع''۔وہ کہتا تھا فرشتہ......وہ کہتا تھا......کیا کمال کہتا تھا۔

''اگر میں تمہیں چھوڑ کر چلی جاؤں تو تم......تم......کیا کرو گے؟''وہ جاننا چاہتی تھی کہ جو اسے فرشتہ کہہ رہا ہے،وہ خود کس درجے کا فرشتہ ہے۔

''کرنے والا کرے گا جنت !بھلا انسان بھی کبھی کچھ کر سکا ہے۔پہلے بھی میں نے تو کچھ نہیں کیا۔''

دنیا جہاں کی تکلیفیں ایک طرف تھیں اور لاچاری ایک طرف تھی۔اگر وہ اس کے زخم بھی دھو نہیں سکتی تھی،تو وہ دنیا کی تندرست لیکن لاچار ترین انسان تھی۔بے بس وہ نہیں جو بستر پر ہے،معذور ہے۔بے بس وہ ہے جو اپنے اندر انسانیت نہیں جگا پایا۔وہ انسان ہو کر، انسانیت نہ دکھا سکتی تو پھر صاحب لبیک نہ رہتی۔

صاحب کسوہ......والدہ کسوہ......

آمنہ......وہ اتنا بڑا محل نما گھر تھا کہ اسے محسوس ہوتا تھا کہ ساری دنیا اس گھر میں سما گئی تھی۔ملازم بھاگے پھرتے تھے،پھر بھی اس محل کے کام ختم نہیں ہوتے تھے۔وہ باغ کے کونے میں کسوہ کو لے کر بیٹھ جاتی تھی۔وہاں اسے کھلاتی،نہلاتی،اور پھر سبز گھاس پر سلا دیا کرتی تھی۔کسوہ کی نانی کا نکاح اپنی عمر سے بیس،بائیس سال چھوٹے معمولی حیثیت کے لڑکے سے ہوا تھا۔وہ ایک بار پہلے بیوہ ہو چکی تھیں۔بے اولادی کی مہر بھی ساتھ تھی،کوئی نکاح کرنے کے لیے راضی نہیں ہوتا تھا۔جو ہوتے تھے وہ والد کی دولت کے لیے ہوتے تھے۔ والد نے مرنے سے پہلے تھوڑی بہت شرافت دیکھ کر نواص سے نکاح پڑھوا دیا تھا۔دولت ملنے کے بعد شرافت خباثت میں بدل گئی تھی۔ایک بیٹی کبریٰ ہوئی تو بے اولادی کی مہر زائل ہو گئی۔لیکن بیٹوں کی خواہش میں اس نے تین اور شادیاں کر لی تھیں۔گھر میں ان ہی تین بیویوں اور ان کی اولادوں کا ہجوم تھا۔

کسوہ،ضعیفہ، جنت......انہیں اس محل میں کوئی بھی پسند نہیں کرتا تھا۔لیکن وہ محل ضعیفہ کا تھا۔انہیں وہاں برداشت کرنا مجبوری تھا۔ضعیفہ مرتی بھی نہیں تھی،جوانی میں آنکھوں میں خرابی ہوئی تھی۔عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ بیماری بڑھتی گئی اور پھر آنکھوں کا نور بالکل ہی بجھ کر رہ گیا تھا۔لیکن اس کی زندگی کا چراغ نہیں بجھ رہا تھا بس۔کسوہ کے والد بھی دوسری شادی کر چکے تھے۔بیوی کو زمین میں دفنا کر،بیٹی کو

نانی کی گود میں دبا کر فاتحہ پڑھ چکے تھے۔

اتنا بڑا گھر تھا لیکن دانے دانے پر لڑائی ہوتی تھیں۔ آمنہ نے اپنا منہ سی لیا تھی، اگر وہ اس سے گھر کے کام کرواتی تھیں تو وہ کر دیا کرتی تھی۔ ضعیفہ نے منع کیا تھا کہ وہ کسوہ کے لیے آئی ہے، گھر کے کاموں کے لیے نہیں لیکن وہ نرمی سے ضعیفہ کو خاموش کروا دیا کرتی تھی۔ اس کے پاس حق ہی کہاں تھا کہ وہ حقوق اور انصاف کی بات کرتی۔ اس گھر میں دنیا جہاں کی آسائشیں تھیں لیکن بس انسانیت نہیں تھی۔ وہاں سب آقا بنے ہوئے تھے کہ شیطان کے غلام بن گئے تھے۔ ملازموں کو جوتیوں سے مار لیتے تھے۔ انہیں کئی کئی دن بھوکا رکھتے تھے۔ کسی پر زیادہ غصہ آتا تو اس پر کوئی نہ کوئی الزام لگا کر نکال دیتے تھے۔

''اور برا یہ طوائفوں کو کہتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ وہ اپنے گناہ کے لقب سے یاد کی جاتی ہیں۔ اور ان کا کیا، جو اپنے گناہ چھپا کر، شریف بن کر، گناہوں کی ادائیگیوں کے سب انداز یاد کر لیتے ہیں؟'' وہ ضعیفہ سے کہہ رہی تھی۔ وہ نابینا تھیں لیکن شعور میں بیدار تھیں۔

''ٹھیک کہا آمنہ! بد نصیب ہے وہ انسان جس کی ساری انگلیاں دوسروں کی طرف اٹھی ہوئی ہیں، اور ایک بھی انگلی اس کے اپنے گریبان کی طرف اشارہ کرنے سے قاصر ہے۔ جب تک والد زندہ تھے، گھر میں رحمت کے فرشتوں کا آنا جانا تھا، اب تو گھر سے وحشت ہی ختم نہیں ہوتی۔ میں صلوۃ سے اس وحشت کو دور بھاگنے کی کوشش کرتی ہوں، لیکن ایک میری صلوۃ سے وحشتوں کے اندھیرے کیسے کم ہوں گے...... تکبیر تو سب پر فرض ہے نا......''

تکبیر فرض ہے......اور تعظیم دوسرا فرض......

اس کے اپنے دل کے وحشتوں کے اندھیرے کم ہو رہے تھے۔ کسوہ کی والدہ حافظ قرآن تھیں، تو وہ بھی کسوہ کو گود میں لے کر صبح و شام قرآن پڑھتی رہتی تھی۔ کسوہ کے لیے وہ درس لینے لگی تھی۔ جو کچھ سمجھ کر، سیکھ کر آتی تھی، وہ کسوہ کو سناتی رہتی تھی۔ کسوہ کوئی بات نہیں سمجھتی تھی لیکن وہ اس کی شفاف پلیٹ پر ''تحریرِ حق'' لکھ رہی تھی۔ اسے کسوہ الکعبہ بنانا تھا۔ اس جماعت کا حصہ بننا تھا جس میں نیک اور پرہیزگار والدین کی اولادیں شامل ہوتی ہیں۔ جو زیرِ لب قرآن پڑھتے ہوئے، غلافِ کعبہ بناتے ہیں۔ یہ ضروری تھا کہ اس کے دل و دماغ کو شفاف کیا جائے۔ روح کو نیک اور دل کو بیدار کیا جائے......رب کعبہ کے گھر کے، غلاف کعبہ کے لیے پہلے اسے ''پاک'' کیا جائے۔

وہ سب ملازموں میں سب سے خوب صورت تھی۔ وہ اپنا چہرہ ڈھانپ کر رکھتی تھی۔ گھر میں مرد ملازم تھے، ورنہ بڑی عمر کی عورتیں۔ اس کی عمر کی لڑکیاں نہیں تھیں۔ نواص کی بیویاں نہیں چاہتی تھیں کہ وہ وہاں رہے۔ اس کے وہاں قیام کو زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ خادموں میں چہ مگوئیاں ہونے لگی تھیں کہ جلد ہی نواص آمنہ سے بھی نکاح پڑھوا لے گا۔ وہ اتنی خوفزدہ ہوگئی کہ حد نہیں۔ وہ اپنی جان پر سوسختیاں جھیل چکی تھی، لیکن یہ سختی نہیں جھیل سکتی تھی کہ ایسا ظالم اور بدنیت انسان اسے اپنے نکاح میں لے۔ لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی، اس کی تیسری بیوی نے، اس کے حسن سے خائف ہو کر، اپنی ہونے والی سوتن پر بہانے سے گرم تیل گرا کر اسے نواص کے نکاح سے خارج کر دیا۔ کھال جل کر سکڑ گئی تھی۔ چہرے کی ہڈیاں کیسی بدہیبت ہوگئی تھیں۔ تڑپ تڑپ کر کروٹیں بدلتے، اس رات وہ بڑبڑا رہی تھی......

''عزیزہ! تم نے کہا تھا قحبہ خانے سے باہر بہت سکھ ہیں......بہت عزت ہے......آؤ حق کی طرف کہ اس کے سوا کوئی راستہ

نہیں......تم نے کہا تھا، آمنہ! اپنی قدر جاننا چاہتی ہو تو قحبہ خانے سے باہر نکل جاؤ، میں نکل آئی تھی......دیکھو......دنیا نے میری کیا قدر کی۔ مجھے ماں یاد نہیں آئی میں نے اسے دیکھا نہیں۔ مجھے......ہاں مجھے خدا یاد آتا ہے......دیکھا تو میں نے اسے بھی نہیں......"

وہ سسک رہی تھی۔ ہچکیاں لے رہی تھی۔ "خدا......کیا وہ جانتا ہے کہ آمنہ تکلیف کے پہاڑ سر کر رہی......"

"خدا......کیا وہ بھی میری اتنی ہی قدر کرتا ہے......جتنی دنیا نے کی......"

☆ ...... ☆ ...... ☆

دنیا......اس کا یہ مقام ہے کہ اس بنانا پسند کیا گیا......

دنیا......اس کی یہ اوقات ہے کہ اسے دھوکے کا گھر کہا گیا......

زمین اپنے سارے خزانے الٹ دے اور انسان کی جھولی بھر دے، پھر بھی انسان کی لالچ کا پیٹ خالی ہی رہے گا۔ لالچ ایسا پودا ہے، جس انسان کے دل میں اگ آتا ہے، نیک نیتی کی ہر فصل زہریلی کر کے چھوڑتا ہے۔ وحشت کی ایک ابتداء لالچ سے بھی ہوتی ہے۔ وحشت کی ایک ابتداء سب کچھ پا لینے کی حرص سے بھی آتی ہے۔

ان کی انگلیاں کٹتی جا رہی تھیں۔ ان کی کمریں کوڑوں سے، ورنہ گرم سلاخوں سے داغی جا رہی تھیں۔ جواہرات سے طون کا صندوق بھرتا جا رہا تھا۔ آئے دن منڈیوں سے بچیاں خرید کر لائی جا رہی تھیں۔ زہریلی، دلدلی زمینوں پر ہاتھ مارنے سے وہ عجیب و غریب بیماریوں کا شکار ہو چکے تھے۔ ان کے زخم کانٹے دار جھاڑیوں جیسے ہو چکے تھے۔ کاٹتے تھے، چبھتے تھے، رستے تھے۔

تین مہینے گزر چکے تھے، ان کے ہاتھ کچھ نہیں آیا تھا۔ وہ سب کو قطار میں کھڑا کر کے، انگلیاں کاٹتے جا رہا تھا۔ پنڈلیوں میں دہکتی سلاخیں پہلے ہی داغی جا چکی تھیں۔ خوف سے بچیوں کی ہچکیاں بندھی تھیں۔ کیسے کیسے گڑگڑا کر وہ اس سے رحم مانگ رہی تھیں۔ بے رحمی کا شکار عورتیں چپ تھیں۔ وہ اتنی انگلیاں کٹوا چکی تھی، اتنا گڑگڑا چکی تھیں کہ اب سمجھ چکی تھیں کہ گھنے جنگلوں میں آسمانی ہوائیں نہیں چلا کرتیں۔

عزیزہ قطار میں سب سے آخر میں کھڑی تھی۔ وہ چند موتی کھود نکالنے میں کامیاب ہو چکی تھی اور اسے بخش دیا گیا تھا۔ لیکن اس کے علاوہ ایک ایک کو سبق سکھانے کا ارادہ کر لیا گیا تھا۔ بچیاں خون کے آنسو رو رہی تھیں۔ درخت دیو بن گئے تھے اور جھاڑیاں ڈائنیں......

ایک بچی تو بالکل آمنہ جیسی تھی۔ روتی تھی تو عزیزہ کا دل کھنچتا تھا۔ وہ انہیں اپنے نوالے دیتی رہی تھی۔ ان کے زخموں پر مرہم بنا بنا کر لگاتی رہی تھی......ماں......ماں......کی پکار کرتے ان کے دلوں کو اپنے سینے سے لگاتی رہی تھی۔

وہ سب کی سب آمنہ تھیں......جنت تھیں......عزیزہ تھیں......

وہ اپنے دل کے ٹکڑے بازار میں فروخت ہوتے ہوئے دیکھ چکی تھی۔ وہ دیکھ چکی تھی کہ کس کس خصلت کے لوگوں نے انہیں خریدا ہے۔ اس کا دل جانتا تھا کہ وہ اب تک کیسے صبر کے گھونٹ بھر کر زندہ تھی۔ اب پھر سے وہ کیسے انہیں موتیوں کے مول پر جان سے جانے دیتی۔ وہ کیسے ان کی انگلیاں کٹتے ہوئے دیکھ لیتی۔

''طون !میری بات سنو......رک جاؤ......میں تمہیں ایک بڑا خزانہ ڈھونڈ کر دوں گی......تم میری آمنہ کو چھوڑ دو۔''

بچی کی انگلی حبشی کے ہاتھ میں تھی، خوف سے بچی کی چیخوں سے جنگل گونج رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے لپک کر بچی کے پاس آئی تھی، اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''کیا کہا......؟خزانہ......''طون عزیزہ کی باتوں کو اتنی اہمیت تو دیتا تھا کہ اپنے فیصلوں پر نظر ثانی کیا کرتا تھا۔

''ہاں......اللہ کی مدد سے......مجھے چند دن دو......میں تمہیں خزانہ ڈھونڈ دوں گی......تم ان سب کو چھوڑ دو......''

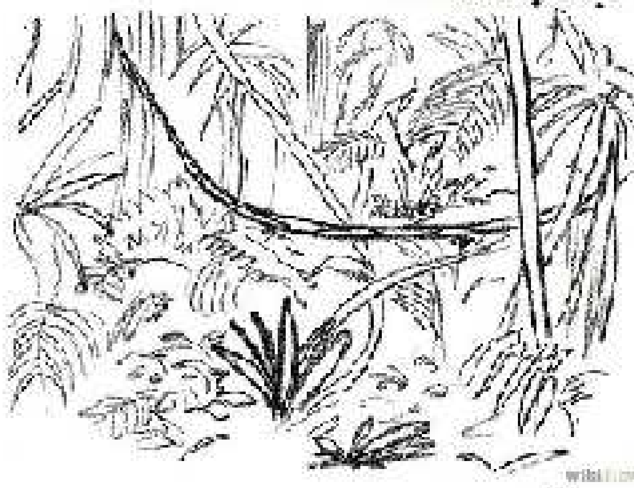

''تو آج کیوں نہیں ڈھونڈ دیا......؟''وہ تمسخر سے ہنس دیا۔

''آج کی ناکامی کا سورج غروب ہو چکا ہے، کل کامیابی کا سورج بلند ہو گا......''

''مجھے خزانہ چاہیے......تمہاری نصیحتیں نہیں......''

''تمہیں وہی ملے گا جو تمہیں چاہیے......جو تمہارا ہے......''(پتھر، سزا، خدا کی ناراضگی)۔

''اگر خزانہ نہ ملا تو تمہاری انگلیاں کٹیں گی، میں نے تمہیں چھوڑا ہوا تھا......ابتدا تم سے ہوگی......''

ابتداء اس سے ہی ہوئی تھی......

خزانے کے نام پر اس کے ہاتھ چند سونے کے سکے اور کچھ موتی آئے تھے، اور اس کے انعام میں اس کے بائیں ہاتھ کی دو انگلیاں جڑ سے کاٹ دی گئی تھیں۔ اس کی سسکیاں زمین کے ہر خزانے سے لپٹ گئی تھیں......اور وہ ان سے کہتی تھیں

''جو دل کی زمین کھود کر، مقصود حقیقی کا خزانہ نہ نکال سکے، اس کے نصیب میں ''زمین کے خزانے'' ہی آتے ہیں۔ اور ایسے لوگ بد نصیب کہلاتے ہیں۔''(کلام حق)

اس کی قسمت اچھی تھی، اسے کچھ نہ کچھ ملتا رہا تھا۔ وہ ایک جگہ اکھٹا کر لیا جاتا تو خزانہ ہی بنتا......لیکن باقی کے لوگ......وہ خالی ہاتھ رہ جاتے۔ وہ دن میں ملنے والی اپنی چیزیں ان میں بانٹتی رہی تھی۔ اس نے آمنہ، جنت کو بچا لیا تھا، لیکن وہ خود کو نہیں بچا سکی تھی۔ وہ اپنی انگلی کی تکلیف سہہ لے گی، کیونکہ اس نے اپنا سینہ ہر تکلیف کے لیے کھول دیا تھا۔ اس نے ہر آزمائش پر لبیک کہہ دیا تھا۔ غلام بن کر اگر وہ کوئی عظمت دکھا سکتی تھی تو اس نے عظمت کا وہ تاج اپنے سر پر پہن لینا چاہا تھا۔ اگر چھری کے نیچے اسے اپنی شہ رگ رکھنی تھی......تو وہ رکھ چکی تھی......کیونکہ بچیوں کی آہیں، سسکیاں، ماں ماں کی پکار، اس کا دل چیر پھاڑ ڈالتی تھیں۔ وہ اتنی زیادہ انسان تھی کہ بے حس نہیں بن پا رہی تھی۔

''قربانی اپنی جان عزیز پیش کر دینے کا نام ہے۔ کیا کسی نے اپنی جان بچا کر بھی عظمت پائی ہے۔''(کلام حق)

☆ ...... ☆ ...... ☆

امیر کاروان نے دیوانوں کی طرح اپنے تین حاجی ڈھونڈے تھے۔ لیکن اسے ان کا کوئی نشان نہیں ملا تھا۔ وہ ہر اس عہدے دار سے ملا تھا، اس کی مدد لی تھی جس کی مدد سے ڈاکوؤں کا یا ان تینوں کا کوئی نشان مل سکتا۔ نشان ملا تھا تو بس اتنا کہ انہیں چور بازار

میں سر بازار نیلام کیا گیا تھا۔ یہ بات سن کر وہ کھڑا کھڑا ڈگمگا گیا تھا...... وہ مرد تھا...... لیکن اس کی آواز وہ بیٹھ گئی۔ اور اس کی آنکھوں میں نمکین ستارے چمکنے لگے تھے...... یہ وہی کیفیت تھی جو والدہ کی شہادت کا سن کر ہوئی تھی۔

''کیا کہا......'' حلق سے آواز نہیں نکلی تھی، اس نے بتانے والے کے شانے کا سہارا لیا تھا کہ وہ گر نہ جائے۔

''وہ چور بازار میں نیلام ہوئی تھیں ابن موسیٰ! ایک عرصہ یہ بات آس پاس بہت مشہور رہی ہے۔ کچھ کہتے تھے تین حاجی فروخت ہوے...... کچھ کہتے تین طوائفیں...... وہ کون تھیں ابن موسیٰ!؟''

''وہ...... وہ...... ہماری تین آزمائشیں تھیں......'' ابن موسیٰ نے اپنی نم آنکھیں رگڑیں۔

''وہ حق تھیں...... جنہیں ہم نے باطل کیا......''

وہ واپس مصر لوٹ گیا کہ شاید درویش تک کوئی خیر خبر پہنچی ہو۔ عزیزہ بہت ذہین اور تند تھی، شاید کوئی چارہ کرنے میں کامیاب ہوگئی ہو۔ لیکن درویش کی صورت دیکھتے ہی ابن موسیٰ سب سمجھ گیا۔ بھلا بازاروں میں بکنی والی چیزیں بھی کبھی واپس آئی ہیں۔

''مجھے معاف کر دو درویش! میں نے اپنا کاروان لٹوا دیا...... اپنے حاجی گنوا دیے......''

درویش خاموش رہا لیکن کوئی بھی دیکھ سکتا تھا کہ وہ کس تکلیف سے گزر رہا ہے۔ اس نے درویش سے چور بازار کی بات پوشیدہ رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اس بزرگ کو اور تکلیف نہیں دے سکتا تھا۔

''مجھے معاف کر دو درویش! ابن موسیٰ کو معاف کر دو......''

''امیر کارواں! میرا تم سے کوئی شکوہ نہیں......'' درویش نے ''امیر'' کو مخاطب کیا۔

''ہونا چاہیے...... ہونا چاہیے...... جیسے ابن منصور نے دہائیاں دی تھیں، تم بھی دو۔ لعن طعن کرو۔''

''وہ میری بیٹیاں تھیں امیر! خدا جانتا ہے کہ میں ہر سانس، آہ میں کاٹ رہا ہوں۔ ان کی سلامتی کی دعاؤں کو عبادت بنا لیا ہے۔ حاجیوں کی زبانی اس واقعہ کی خبر سن کر میرا دل دنیا کی کم ظرفی پر بلبلا اٹھا تھا۔ میرے پھولوں کو صحرا میں لے جا کر مسل دیا گیا۔ میری تبلیغ کی خوشبو کو گناہ کہا گیا...... ان کی توبہ کو مذاق بنایا گیا۔ ان کے ماضی کو ان کی سزا بنا دیا۔ یہ دنیا...... یہ لوگ...... میں حق پر قائم رہوں تو بددعا کیسے دوں۔ میں بددعا دوں تو پھر حق پر کیسے رہوں؟ کاش ایک پل کے لیے میں ''حق'' کو بھول جاؤں اور پھر اپنی جھولی میں آگ بھر بھر کر ان لوگوں کی کی طرف اچھال دوں۔ جن پر خدا نے کوئی قہر نازل نہیں کیا، اس پر دنیا نے عذاب کیوں اترا......''

ایک باپ اپنی اولاد کے لیے کیسے تڑپ رہا تھا، ابن موسیٰ دیکھ سکتا تھا......

امیر کاروان......

امیر کاروان کو مصر میں حراست میں لے لیا گیا تھا۔ اس کی آمد کا انتظار کیا جا رہا تھا، اس کے پیچھے شاہی دستے بھی بھیجے گئے تھے لیکن وہ سب کو جل دے چکا تھا۔ ابن منصور نے اس کے کھاتے میں سارے گناہ ڈال کر اسے عہدے سے برخاست کروا دیا تھا۔ وہ ہنس دیا تھا۔ اس نے یہ عہدہ رکھ کر اب کرنا بھی کیا تھا۔ جب وہ یہ ہی نہیں سیکھ سکا تھا کہ ایسے کاروانوں کے امیر نہیں بنتے، جو حق کی طرف سفر کرتے ہوں

اور حق سے ہی نابلد ہوں۔ جو اس گھر کا طواف کرنے کا ارادہ کرتے ہوں، جس کا طواف عرب و عجم کرتے ہوں، گورے اور کالے کرتے ہوں، نیکوکار اور بھٹکے ہوئے بھی کرتے ہوں اور پھر وہ "حسب نسب" کی بات کرتے ہوں۔ بھلا عبادتوں میں حسب نسب ہوتے ہیں؟

"صرف اس لیے کہ میں نے طوائفوں کو کاروان میں سفر کی اجازت دی؟" وہ مجلس کے ارکان سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں...... اس لیے کہ تم نے اصولوں کی بے حرمتی کی......"

"اصول؟ کون سے اصول؟ کہ غلاف کعبہ کے ساتھ گستاخ نہیں جائیں گے؟ کیا آستین کا سانپ ابن منصور گستاخ نہیں؟ یہ طوائف نہیں کہلاتا، لیکن یہ طوائفوں سے بدتر ہے......" اس نے آواز کو بلند کر کے کہا تھا۔

"اصول، اصول ہوتے ہیں ابن موسیٰ! ہم پر ہمارے رب کے گھر کی حرمت فرض ہے......"

"اس گھر کی حرمت سے پہلے اس رب کے ہر حکم کی حرمت فرض ہے...... ہم پر...... سب پر...... اور یہ اس کا حکم ہے، عرب و عجم برابر ہیں...... کسی کو کسی پر کوئی برتری نہیں......"

"یہاں نسل کی نہیں عمل کی بات ہو رہی ہے......"

"نہیں محترم...... یہ کلمہ حق، دین حق کی بات ہو رہی ہے۔ مجھے بتا لینے دیں کہ میں نے اپنا کاروان، اپنے تین حاجی لٹا کر، دین کے حق کو سمجھ لیا ہے۔ میں نے اب جانا کہ ہمارے دین کا کلمہ کیا ہے...... حق ہے، حق ہے، حق ہے...... دین جب برابری کی بات کرتا ہے تو وہ حق کی بات کرتا ہے...... حقوق کی...... وہ کسی کو یہ حق نہیں دیتا کہ کسی دوسرے سے اس کا جائز حق چھین لیا جائے۔ جو کسی ایک کے حق سے پھر گیا، وہ دین پر کامل کیسے رہا؟ جس نے کسی ایک کا حق چھین لیا وہ مومن کیسے رہا...... اس زمین کا ہر انسان اپنے عمل کا ذمہ دار خود ہے، لیکن اس زمین کا کوئی بھی انسان دوسرے انسان کے عمل پر حساب کتاب کا ذمہ دار نہیں ہے۔ گستاخ کا لقب دینے کا، گناہ گار مان لینے کا، طوائف کو بے دخل کر دینے کا، کافر کافر کا نعرہ بلند کرنے کا...... گستاخ تو وہ ہے جو انسانوں پر "حد" لگاتا ہے۔

مجھے بتا لینے دیں کہ دین "جرات" کا نام ہے۔ حق کو جرات سے بلند کرنے کا نام ہے۔ مجھے قاہرہ سے، میدان کاروان سے ہی ان تینوں کو پورے اعزاز کے ساتھ شامل کرنا چاہیے تھا۔ پوری جرات سے...... مجھے انہیں چھپانا نہیں چاہیے تھا...... جو لوگ انہیں کاروان میں شامل کرنے سے انکار کرتے، ان کے خلاف جہاد کرنا چاہیے تھا۔ انہیں چھپا کر میں نے گناہ کیا۔ اسی لیے میرا کاروان لٹا...... اسی لیے میں نے بدو کے جوتے کی نوک سہی...... اسی لیے...... اسی لیے...... میں اس عہدے سے خود سبکدوش ہوتا ہوں۔ جس امیر کاروان، امیر جماعت میں، کلمہ حق بلند کرنے کی جرات نہ ہو، اس پر حق پر چلنے والے کاروانوں کی امامت بھی جائز نہیں۔"

مجلس میں سناٹا چھا گیا تھا۔

"اگر مصر نے حق کو تسلیم نہ کیا، حق کو لاگو نہ کیا...... تو پھر...... اس کے ساتھ بھی وہی ہوگا، جو میرے کارواں کے ساتھ ہوا۔ حج مدرس ہے...... اسباق کا...... احترام کا...... رواداری اور برداشت کا...... یہ طواف ہے امیر غریب، کالے گورے، مرد عورت، جوان بوڑھے، محرم، نامحرم، نسل، نسب، عمل...... ہر امتیاز مٹا کر...... انسان ہو کر...... بندگان ہو کر...... برابر ہو کر...... برابر سمجھ کر...... لبیک کہنے کا......

کیا سیاہ وسفید میں کوئی تفریق ہے......ایک کسی رنگ سے نکل کر نہیں بنتا۔ایک پر کوئی دوسرا رنگ نہیں چڑھتا ہے۔ یکتا اور کامل۔ حج کیا ہے؟ کیا یہ برابری نہیں ؟تو پھر مومن اور گناہ گار کیوں نہیں۔ جب احرام جسم کوڈھانپ لیتا ہے تو کیا خدا کا رحم گناہ کو نہیں ڈھانپ لیتا۔ اللہ تک جانے کے راستوں پر کبھی دروازے نہیں ہوتے۔ ہر راستہ ہمیشہ کھلا ملتا ہے۔اللہ نے سب کو اپنی طرف آنے کی اجازت دی ہے، پھر یہ اجازت ہم نے کیسے روک لی۔ یہ امیر کی، خلیفہ کی، فقیر کی، عالم کی عبادت نہیں ہے ......یہ ''برابری'' کی عبادت ہے۔کوئی عبادت برابری کی ایسی شاندار مثال قائم نہیں کرتی ، جو حج کرتی ہے۔اعمال ناحق سے، اعمال حق کی طرف آنا......وقوف (وقف) کرنا......سعی (کوشش) کرنا......دین حق کی حد میں رہنا۔جس نے اپنا نفس قربان نہیں کیا، باطل کی شہ رگ پر چھری نہیں پھیری ،اس نے کچھ قربان نہیں کیا۔جس نے اپنے اندر کے شیطان کو کنکریاں نہ ماری ہوں، وہ دکھاوے کی کنکریاں مار کر کیا کر لے گا؟''

''تم تقریر اچھی کر لیتے ہوابن موسی......'' ابن منصور نے جل کر کہا۔وہ دیکھ رہا تھا کہ ارکان مجلس متاثر ہو رہے ہیں۔

''میں یہ جرات پا چکا ہوں اور بلند بانگ کہتا ہوں۔ ''جس میں حق نہیں ......اس کا حج نہیں......''

جس میں حق نہیں......جسے حق کی سمجھ نہیں......

استاد محترم اور اس کے کچھ بااثر دوست مصر آ چکے تھے۔مہینوں یہ مقدمہ چلتا رہا تھا۔اسے قید خانے بھیجنے کا ابن منصور کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکا تھا۔اسے قید کر دیا جاتا تو بھی اسے پرواہ نہ ہوتی، لیکن اس نے صحرا میں سیکھے ایک سبق پر عمل کرنے کے بارے میں سوچ لیا تھا۔

''پہلے جماعت کے دشمنوں کا سر کچلتے ہیں، کیڑے مکوڑوں کو بچھو بننے کی مہلت نہیں دیتے۔''

بچھو کے لیے وہ سارے ثبوت اکھٹے کر کے لے آیا تھا۔اس نے کاروان حج میں جاسوسوں کو جگہ دی تھی۔ وہ بدوؤں کے ساتھ ملا ہوا تھا۔شرکت داری کی تھی۔اس نے چور بازار فروخت ہونے والیوں کی قیمت ابن منصور سے لی تھی۔

اتنا سب ہونے پر بھی وہ اس قابل نہیں رہا تھا کہ قاہرہ کی گلیوں سے گزر سکتا۔وہ اپنا اسباب سمیٹنے جا رہا تھا۔ بچے کھیل رہے تھے اور وہ رک کر اس امیر کو دیکھ رہے تھے، جس کے بارے میں سال بھر عجیب وغریب باتیں گردش کرتی رہی تھیں۔ جسے بہت سے نئے لقب دیے گئے تھے۔ جو قاہرہ کے ہر گھر میں سوالوں کی زد میں رہا تھا۔ جو مصر کی شان تھا اور یہ شان خاک ہو چکی تھی۔ وہ دیکھ رہے تھے اس امیر کو جس کے ساتھ جانیوالے کاروان پر حملے کی کہانیاں، گناہ کی طرح بدنام ہوئی تھیں۔ وہ وقت کے بدلنے پر ہنس دیا تھا۔اسے سلام کرنے والے اب اس سے سوال کرنا بھی پسند نہیں کر رہے تھے۔وہ کاروان لٹا بیٹھا تھا......واقعی میں اپنا سب کچھ لٹا بیٹھا تھا......وہ سمجھ گیا کہ یہ دنیا کا دوسرا رخ ہے۔اس نے طلوع آفتاب دیکھا تھا، اب غروب آفتاب دیکھنا بھی ضروری تھا۔وہ ہنس دیا......وہ مسکرا دیا......

''کیا اب بھی تم امیر بننا چاہتے ہو......؟''

گھر کی طرف جاتے ہوئے، کھیل کود میں مصروف بچوں میں سے وہ اس بچے سے پوچھ رہا تھا جس نے اس سے کہا تھا کہ وہ امیر بننا چاہتا ہے۔

دوسری اور آخری قسط

بچے نے کچھ دیر سوچ اور پھر سر ہلا دیا۔ ''میں ابن موسی بننا چاہتا ہوں ......''

''ابن موسی ...... کیوں؟''

''سنا ہے آپ ان لوگوں کو کاروان میں لے گئے تھے، جنہیں کوئی پسند نہیں کرتا تھا۔ میں بھی ایسا ہی کروں گا۔''

''کس لیے ......؟'' وہ بچے کی زبان سے، آسمان کا فرمان سننا چاہتا تھا۔

''والدہ کہتی ہیں، جسے ساری دنیا ناپسند کرے، اسے پسند کرنے کی نیکی ضرور کرنی چاہیے۔ جسے ساری دنیا دھتکار دے، اسے گلے سے لگانے کا کام ضرور کرنا چاہیے ...... میں بھی یہ کروں گا امیر! میں بالکل آپ جیسا بنوں گا ......''

اس نے جھک کر بچے کے گال چوم لیے۔ ''ہاں! بالکل! ایسا ہی کرنا ...... جسے ساری دنیا گالیاں دے، جس پر ساری دنیا تھوک دے ...... اس کے آنسو پونچھ کر، اسے سینے سے لگا کر، مخلوق خدا میں برابری کا علم بلند کرنے کا کام ضرور کرنا۔ ہمارے پاس اعتراض کا حق تو ہو سکتا ہے لیکن نفرت کا نہیں ...... کبھی نفرت نہ کرنا ...... نفرت کی ہر کڑی دل پر بھاری ہے۔ اور اپنی محبت کا اعلان شجاعت سے کرنا، پھر تمہارا کاروان کوئی نہیں لوٹ سکے گا۔ تمہاری منزل کوئی نہیں چھین سکے گا۔''

اسباب سمیٹ کر وہ اپنے گھوڑے پر بیٹھ گیا۔ ''خدا حافظ قاہرہ! میں حق کو واپس نہ لا سکا تو خود بھی واپس نہیں آؤں گا۔''

''حق کی طرف ''خوش آمدید'' امیر کارواں ...... تم ناکام بھی رہے تو کامیاب ہو گے۔'' قاہرہ نے جواباً کہا۔

☆ ...... ☆ ...... ☆

زندگی کی مشقتیں ختم نہیں ہوتیں، انسان کی ہمت بھی تو کم نہیں ہوتی۔ اس کی ہتھیلیاں مراد کے زخم چرا بیٹھی تھیں۔ ان پر بلبلوں کی طرح زخم ابھر رہے تھے۔ اس نے خود کو اندھیرے میں پایا تھا۔ تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ کئی دنوں سے بارش ہو رہی تھی۔ وہ ایسے دل دہلا دینے والے طوفان میں درخت سے تازہ پتے توڑنے کے لیے آئی تھی۔ جو صحرا کی ساری بجلیاں خود پر سہہ چکی تھی، اسے اب کسی طوفان سے ڈر نہیں لگتا تھا۔ وہ بھیگ چکی تھی، سردی سے کانپ رہی تھی۔ پتے توڑتے ہوئے اس کی نظر اپنے جسم پر بننے والے داغوں پر پڑی تو اس نے جھٹکے سے آستین کو اُوپر کھینچا اور دیکھا ...... گردن پر ہاتھ پھیرا ...... وہاں بھی کچھ محسوس ہو رہا تھا ...... وہ اتنی حواس باختہ ہو گئی کہ ہوا کے تیز جھکڑ کے ساتھ کئی قدم دور کھینچتی چلی گئی ......

آسمان کی کڑکتی بجلیوں میں، اس نے اپنی ہتھیلیوں کو دیکھنا چاہا۔ وہ ہاتھوں کو اوپر نیچے لہرا کر، آنکھوں کے سامنے لا کر دیکھ رہی تھی ...... وہ ...... وہ ...... مراد کی ہتھیلیوں جیسی تھیں ...... تازہ پتوں کا ڈھیر وہیں پڑا رہ گیا تھا اور وہ ساری دنیا کو پیچھے چھوڑ کر شہر کی طرف بھاگ گئی تھی۔ ایسی طوفانی بارش میں، وہ سب سارا جہاں بھلا کر بھاگ رہی تھی۔ وہ روتی جا رہی تھی ...... وہ کمزور تھی، وہ ناتواں تھی۔

''تم اتنی خوفزدہ کیوں ہو۔'' ایسی طوفانی بارش میں، وہ جس حال میں طبیب کے پاس آئی، وہ اس پر ترس کھائے بغیر نہیں رہ سکا تھا

''میری ہتھیلیاں مراد کے ہاتھوں جیسی کیوں ہو رہی ہیں؟''

''بیماری تم تک آئی تو ہے ...... بڑھ بھی سکتی ہے ...... اگر تم کچھ عرصہ اس گھر سے دور رہو تو یہ ٹھیک ہو سکتی ہے۔''

''دور......کہاں......؟''وہ ہونقوں کی طرح طبیب اور خود سے پوچھ رہی تھی۔

''اتنا زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے،ان پتوں کو لیپ بنا کر ان پر لگا لو......ذرا احتیاط کرو،فائدہ ہو گا۔''

فائدہ تب ہوتا،جب پہلے ہی نقصان نہ ہو چکا ہوتا۔مراد کے زخم صاف کرنے کے بعد اسے شہر میں چند لوگوں کے گھر جانا ہوتا تھا،وہاں کام کرنا ہوتا تھا۔اس مشقت سے وہ اپنا اور مراد کا پیٹ پالتی تھی۔نکاح کے چند دنوں بعد تک مراد کے سوتیلے بھائی کے گھر سے اناج آتا رہا تھا پھر اس نے آکر سنا دیا کہ وہ مزید ان کا پیٹ نہیں پال سکتا۔وہ چپ چاپ سنتی رہی۔وہ چلا گیا تو مراد نے کہا۔

''میرا سارا حصہ میرا یہ بھائی ہڑپ کر چکا ہے۔دیکھو اس کا دل اتنا تنگ ہو چکا ہے کہ یہ اناج کے چند دانے دینے پر بھی راضی نہیں ہے،حق دار کو حق نہ دو،تھوڑا رحم ہی دے دو۔''

رحم کی تلاش میں وہ شہر چلی گئی تھی۔وہ اس کے سوتیلے بھائی سے ملی تھی کہ وہ اسے ایک چکی لے دے،وہ آٹا پیس کر اپنا پیٹ بھر لے گی۔

''تمہیں آٹا دے گا کون؟جس جگہ تم رہتی ہو،وہاں سے کوئی ایک تنکہ نہیں لے گا۔''اس کی بات ٹھیک تھی لیکن لہجہ بہت خراب تھا۔

وہ گھر گھر گئی،اسے تین جگہ پر کام مل گیا تھا۔کہیں باغ کی صفائی کا،کہیں چکی پیسنے کا،کہیں پانی بھرنے کا۔کنوئیں سے پانی بھرنے کا کام اس کے لیے سخت رہتا تھا۔دور پچھواڑے سے کنوئیں سے پانی بھر کر،دور اندر لانا،پینے کے برتن بھرنا،استعمال کے برتن بھرنا۔آرائش کے حوض صاف کرنا،انہیں بھرنا۔پانی گرم کرنا،مردانہ،زنانہ حمام بھرنا۔رات واپسی پر پہلے مراد کے زخم صاف کرنا۔اسے کھانا کھلانا،اور پھر خود کھانا۔

''میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ میرا بوجھ تم پر سے آسان کر دے۔''

وہ جب نوالے بنا کر مراد کے منہ میں ڈالتی تھی تو وہ بے چارا آبدیدہ ہو جاتا تھا۔ہر بار ہی ہو جاتا تھا۔وہ کچھ ایسا حساس رہا تھا کہ جب جب اس کی طرف دیکھتا تھا،شرمندگی سے نظریں جھکا لیتا تھا۔اور وہ،اپنی چادر سے اس کی نم آنکھیں صاف کیا کرتی تھی۔

''حالات کیسے بھی ہوں،خود کو بوجھ نہیں سمجھنا چاہیے مراد!جسم ناکارہ ہو سکتا ہے،لیکن روح سلامت رہتی ہے۔''

''بڑی شرم کی بات ہے،میری بیوی شہر میں گھر گھر......''

''کیسی شرم؟کرم یہ تو نہیں کہ میں کسی بڑے گھر میں،آرام سے بیٹھ کر نعمتیں کھاؤں۔کیا تب ہی میں خوش قسمت ہوں گی؟''

''تو کیا مجھ جیسے بیماری کی تیمارداری خوش قسمتی ہے......''

''خود ہی تو کہا تھا میں فرشتہ ہوں۔فرشتوں کو ایسی ہی خوش قسمتیاں نصیب ہوتی ہیں۔''

''اس کوٹھری میں سانس نہیں لیا جاتا،تم ناک پر ہاتھ تک نہیں رکھتی......یہیں سو جاتی ہو......''

''اس کوٹھری میں خدا کی رضا ہے۔بتاؤ ناک کیسے ڈھانپ لوں؟اگر میں تمہارے بستر پر ہوتی،تو کیا پھر بھی میں اپنی ناک ڈھانپ لیتی؟''

''تمہارا صبر ستارہ ہے جنت! تمہارا تحمل آفتاب ہے ......''

ستارہ جنت نے ، تین سال اس کی تیماری داری، صبر و تحمل سے کی تھی۔اپنے نفس کے میدانوں میں بھاگ دوڑ کر، عمل صلاح کی سعی کائی تھی۔لیکن اب ......اپنی ہتھیلیوں پر بنے زخم دیکھ کر تڑپ اٹھی تھی۔ایک دم، اسے لگا کہ وہ یہ برداشت نہیں کر سکے گی۔کوئی اس کے اندر کہتا تھا کہ وہ بھاگ جائے ...... چلی جائے ...... سب چھوڑ دے ......

وہ واپس آئی تو کونے میں زمین پر بچھے اپنے بستر پر چپ چاپ بیٹھ گئی۔وہ رو رہی تھی۔مراد نے اپنے بستر سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔وہ بھیگی ہوئی تھی۔وہ کانپ رہی تھی ...... گھٹنے کھڑے کیے، وہ دنیا سے منہ چھپا کر، دنیا سے اپنا غم بھی چھپا رہی تھی۔وہ اتنی ہمت بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اٹھ کر اپنی بیوی کے لیے لکڑیاں جلا کر، اس کی کپکپاہٹ کم کر سکتا۔اس کے آنسو پونچھ سکتا۔

''جنت ...... کیا ہوا؟'' یہ سوال پوچھتے ہوئے وہ بے چارا بڑے کرب سے گزرا تھا۔

جنت نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور واپس اپنا سر جھکا لیا۔

''کیا ہوا جنت ......؟ میری جنت ...... بتاؤ مجھے ......''

''مجھے تمہاری بیماری لگ چکی ہے مراد! ...... مم ......''

''مجھے چھوڑ دو جنت ...... ابھی، اسی وقت ...... یہاں سے چلی جاؤ ...... جاؤ ...... نکل جاؤ اس عفریت سے۔'' اس کی بات کاٹ کر وہ تیز تیز بولنے لگا۔وہ اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔وہ اس تک آ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر دھکیل دینے کی خواہش رکھتا تھا۔

''بھاگ جاؤ جنت! میرا ایک دوست رہتا ہے شہر میں، شاید وہ میری کچھ مدد کر دے۔شاید وہ ایک بیمار کے منت سماجت کی لاج رکھ لے۔تم قاہرہ واپس چلی جانا، وہ تمہارے لیے انتظام کر دے گا۔جاؤ، اسے بلا لاؤ، اور دو اور گواہ بھی ساتھ لے آؤ۔میرے بھائی کو نہ لانا، وہ مکر سکتا ہے۔میں تمہیں طلاق دے رہا ہوں۔'' وہ تیز تیز بول رہا تھا، اس کے لفظ آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔وہ ہکلا رہا تھا۔

وہ حیران مراد کی شکل دیکھنے لگی ...... جو اس کا دل کہہ رہا تھا، وہ اس کوٹھری کا فرشتہ بھی کہہ رہا تھا ......

''جاؤ جنت ...... اس قبر میں میرے ساتھ نہ مرنا ...... میرے ہی بستر پر نہ آ جانا ...... جاؤ ......''

وہ یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔کیسا انسان تھا، اپنا پہلا اور آخری سہارا ابھی چھوڑ رہا تھا۔سسکتی ہوئی موت کو، خوش آمدید کہہ رہا تھا۔کیسا انسان تھا ...... ایسا انسان، آج تک اسے نہیں ملا تھا ...... ایسا انسان ...... ساری دنیا کا ہر انسان اس جیسا کیوں نہیں تھا؟

''تم ایسے بیمار ہو ...... اکیلے اور لاچار ہو۔تم کیسے جانے کے لیے کہہ سکتے ہو ......؟'' وہ اپنی حیرت مٹانا چاہتی تھی۔

''میں ہی تو کہہ سکتا ہوں۔جو میں بھگت رہا ہوں، نہیں چاہتا کہ کوئی اور بھگتے۔چلی جاؤ میری جنت! چلی جاؤ ...... اس بیمار کی درخواست مان لو ......'' کہہ کر وہ رونے لگا تھا۔اس نے ہاتھ بھی جوڑ دیے تھے۔

''میں نے اپنے سوا، دنیا کے ہر انسان سے محبت کی۔تم سے سب سے زیادہ کی۔اس محبت میں تمہیں تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔اس بیمار پر احسان کرو، مجھے اس اذیت سے بچا لو۔بیماری میں بھگت لوں گا، تمہاری اذیت نہیں بھگت سکتا جنت! تمہیں قسم ہے میری ...... جاؤ ورنہ

میں رو رو کر مر جاؤں گا......‘‘

جنت چلی گئی، دور شہر کے کنارے پر اس کے دوست کے گھر کی طرف۔ پہلے مراد نے کسی بھی مدد کے لیے یہ گوارا نہیں کیا تھا کہ وہ اپنے دوست کے پاس اپنی بیوی کو بھیجے، لیکن اب اپنی ساری غیرت کو ایک طرف رکھ کر اس نے جنت کو بھیج دیا تھا کہ وہ بس اسے یہ پیغام دے دے کہ وہ ایک بار آ کر مراد سے مل لے...... صرف ایک آخری بار......

وہ اس طرف پیدل جا رہی تھی۔ جہاں جانے کے بعد شاید وہ واپس قاہرہ پہنچ جانے والی تھی، وہ بار بار اپنے زخموں کو دیکھ رہی تھی، وہ دیکھ رہی تھی کہ...... جس وقت اس نے دروازے پر دستک دی اس وقت تک بھی وہ تصور میں قاہرہ پہنچ چکی تھی...... کہ......

’’جو توبہ کرے، تائب ہو جائے، اس پر دین کا بار زیادہ آ جاتا ہے۔ دیکھو! تمہاری طرف شیطان نے اپنا نشانہ باندھ لیا ہے۔ ان نشانوں کو خطاء کرنا، لیکن خود خطا کار نہ ہو جانا۔‘‘

’’کون...... کیا چاہیے......؟‘‘ دروازہ کھل چکا تھا۔ مراد کے دوست کی بیوی پوچھ رہی تھی۔

’’کون......؟‘‘ وہ خود سے پوچھ رہی تھی...... ’’کون ہوں میں؟ کیا چاہیے مجھے؟ کیا میں حج کے لیے نہیں نکلی تھی؟ روح کی سعی کے لیے...... میں لبیک کہنے...... حج پا لینے کے لیے...... کیا زندگی، کیا ہر عمل، کیا ہر دکھ، ہر کوشش، ہر سفر، یہ عبادت کی کیفیت نہیں؟ نماز کی ادائیگی پانچ وقت ہے لیکن اس کا قیام، ہر سانس ہے۔ ہر سانس خیر ہے...... حج صاحب حیثیت پر فرض ہے، کیا میرا ہر عمل میری حیثیت نہیں؟ کیا میرا احرام، میرا رنگ، میری روح کا نور نہیں ہے؟ کیا وہ...... میرے ہی اندر نہیں ہے......

’’اندر آ جاؤ...... تم شاید مراد کی بیوی ہو......‘‘ دروازہ کھولنے والی کہہ رہی تھی۔

وہ پلٹی اور بھاگتی ہوئی مراد کے پاس واپس آئی......

’’اپنی قسم واپس لے لو مراد! میں اپنی لبیک واپس نہیں لے سکتی......‘‘

اس نے درخت سے پتے توڑے، لکڑیاں اکٹھی کیں اور آگ جلا کر مراد کے لیے اس کی دوا بنانے لگی۔ مراد...... وہ اسے چھوڑ کر چلی جاتی تو پھر دنیا کی ہر نعمت کو خود پر حرام کر والیتی۔ اگر وہ بھی مراد کو چھوڑ دے گی تو پھر دنیا میں کہیں کوئی نیکی نہیں کر پائے گی۔ کوئی عبادت قائم نہیں کر پائے گی۔ رکوع اور سجدے میں جھک نہیں پائے گی...... اگر مراد کو چھوڑ دیا تو...... طواف پر طواف کر کے بھی حاضری نہیں لگوا پائے گی۔

’’کل صبح میں دوسرے شہر جاؤں گی، ایک ایک کر کے ہر شہر جاؤں گی۔ تمہارے لیے طبیب ڈھونڈوں گی۔ تمہیں اللہ کے حوالے کر کے جاؤں گی۔ تم مراد! دوبارہ مجھے ایسی قسم نہ دینا۔ دوبارہ مجھ سے گواہ لانے کے لیے نہ کہنا۔ میں حج کے لیے نکلی تھی اور تم سے آملی۔ دیکھو مراد!...... تمہارے لیے رب نے ہواؤں کا رخ پھیر دیا۔ اس رب کے لیے میں اپنا دل کیسے نہ پھیر دوں۔ میری منزل کے راستے میں اس نے تمہیں رکھ دیا۔ اس منزل تک پہنچنے کے لیے میں تمہیں کیسے چھوڑ دوں؟ تم سے ہو کر ہی مجھے میری منزل ملے گی...... میرا حج...... میرا رب...... میں صاحب حیثیت ہو کر جانا چاہتی ہوں مراد! اور میری حیثیت تم ہو...... میرے صاحب تم ہو...... پہلے تمہیں صبر کا گھونٹ بھر کر

قبول کیا تھا...... آج تمہیں محبت سے قبول کرتی ہوں......"

رب البشر کی محبت کا راز، "محبِّ بشر" میں پوشیدہ ہے۔ انسان...... یہ رب کی محبت کا مرکز ہے۔ اس سے محبت کرنے والا، رب کی محبت کا مرکز ہے۔ (کلام حق کی تحریر)

☆ ...... ☆ ...... ☆

اس کی حیثیت، اس کی شان، کسوہ تھی۔ وہ اتنی بڑی ہو چکی تھی کہ مدرسے جانے لگی تھی۔ وہ روز صبح و شام اسے مدرسے چھوڑنے اور لینے جاتی تھی۔ اس نے بہت تیزی سے قرآن حفظ کیا تھا۔ وہ دوسری بچیوں میں اس لیے بھی ممتاز تھی کہ ایک صرف اس کی والدہ ایسی تھیں جس کا آدھا منہ جلا ہوا تھا۔ جب والدہ مدرسے آتیں تو بچے اسے دیکھ کر سہم جاتے تھے۔ اکثر بچے مذاق کرتے کہ کسوہ کی والدہ چڑیل ہے۔ کسوہ کو کسی نے تنگ کیا تھا تو وہ انہیں کھا جائے گی۔

"کیا آپ چڑیل ہیں؟" کسوہ کے دل کو کتنی تکلیف پہنچتی تھی۔

"چڑیل ہونے میں برا کیا ہے کسوہ؟" وہ اس کا منہ چوم چوم کر تھکتی نہیں تھی۔

"چڑیلیں بری ہوتی ہیں......" وہ منہ لٹکا لیتی۔

"نہیں میری بچی! جو برے ہوتے ہیں، وہ تو کوئی اور ہی ہوتے ہیں۔"

"وہ آپ کا مذاق اڑاتے ہیں......"

"لوگوں کو معاف کرنا سیکھو...... ہر بار...... ہر روز......"

"کیا لوگ ہمیں معاف کرتے ہیں؟"

"اللہ کرتا ہے، سب کو معاف کر دیتا ہے۔ پھر ہمیں لوگوں سے کیا لینا دینا۔ تمہارا امتحان آنے والا ہے، تمہیں عالموں اور استادوں کے سامنے پیش ہونا ہے، تمہاری آزمائش ہو گی۔ تمہیں اس پر دھیان دینا چاہیے۔ جلد ہی تم اپنی والدہ کا خواب پورا کرنے والی ہو، تم کسوہ الکعبہ کی تیاری کی سعادت حاصل کرنے والی ہو۔"

"مرحومہ والدہ کی طرح آپ بھی یہی خواب دیکھتی ہیں۔"

"میں نے سات سال یہ خواب دیکھا ہے کسوہ! صدیاں گزاری ہیں اس خواب کی تعبیر میں۔ کیسے بتاؤں کہ کیسے کیسے دن گنے ہیں، جس دن تم اس مدرسے جاؤ گی، پھر وہ غلاف بیت اللہ جائے گا......"

"اور آپ اور میں بھی جائیں گے۔ جائیں گی نا آپ؟"

"ہاں...... ان شاء اللہ...... بس تم ہر امتحان میں پاس ہو جانا۔ اپنے سبق بھول نہ جانا......"

وہ اپنا کوئی سبق نہیں بھولی تھی...... ہماری عزیزہ......

وہ جنگل سے فرار ہونے میں کامیاب ہوچکی ہے...... وہ یہ خواب کئی بار دیکھ چکی تھی لیکن جیسے ہی وہ جنگل سے باہر نکلتی تھی، اس کے پیچھے بھاگتیں، جنت اور آمنہ رونے پیٹنے لگتی تھیں۔ وہ اس سے کہتی تھیں کہ ایک تم ہی تو ہماری ڈھارس ہو، ہماری ہمت ہو، ہماری تسلی ہو...... تم بھی ہمیں چھوڑ رہی ہو...... کہاں جا رہی ہو عزیزہ......

عزیزہ کہیں نہیں جا پائی تھی۔ وہ ہمت کر کے بھاگ سکتی تھی لیکن وہ انہیں نہیں بھگا سکتی تھی۔ وہ سب حبشیوں اور طون سے ڈرتی تھیں۔ وہ اتنی خوفزدہ رہتی تھیں کہ ایک قدم اس کی مرضی کے بغیر اٹھانے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

طون کے خزانے بھر گئے تھے، لیکن نیت نہیں بھری تھی۔ اس نے دلدل تک سے اسے جواہر سے بھرے صندوق نکال کر دیے تھے۔ ایک غار میں وہ پانچ دن تک پھنسی رہی تھی لیکن اس کے لیے خزانہ نکال کر ہی باہر نکلی تھی۔ وہ کئی بار موت کے منہ جا کر واپس لوٹی تھی، کسی نہ کسی کی جان کا تاوان بھرتی رہی تھی۔ پانچ سال...... آمنہ اور جنت کی زندگیوں کے تاوان......

پانچ سال...... غلام بن کر......

اس نے جنگل کو، درختوں کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ پیروں کی سات انگلیاں، ہاتھ کی تین، جسم پر کوڑوں کی ان گنت ضربیں...... اس نے زمین کو کھوکھلا کر کے، اپنا آپ قربان کر دیا تھا۔ ایک ایک کو بچانے کے لیے اس نے زمین کو اس شدت سے جھنجھوڑا تھا کہ اس نے اس کی ہر پکار پر کچھ نہ کچھ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا تھا۔

جیسے جیسے وہ خزانے نکالتی جا رہی تھی، ویسے ویسے طون اس کے گرد اپنا شکنجہ کستا جا رہا تھا۔ اس کے پیروں میں ایک لمبی زنجیر تھی۔ چار میں سے دو حبشی صرف اس کے نگران تھے۔ طون سے اس کی جرات اور ذہانت چھپی ہوئی نہیں تھی۔ اس کی درویشی اور عظمت بھی۔ جب کبھی اسے لالچ زیادہ ہی ستاتی تھی تو وہ اسے ڈرانے کے لیے باقیوں کو مارنے، پیٹنے لگتا تھا۔ اس کے دل کو چوٹ پہنچا کر، وہ اپنا پیٹ بھرتا تھا۔ وہ جانتا تھا، جب جب اس کے دل پر چوٹ پہنچتی ہے تب تب وہ کوئی بڑا خزانہ نکال کر لاتی ہے۔ سب سے بڑا خزانہ نیم دلدلی زمین سے نکلا تھا۔

ایک خزانہ اس کی روح میں قید تھا، اس کی روشنی سے جہاں منور تھا۔ طون جیسا کم عقل بھی دیکھ سکتا تھا کہ جس عاجز درویش کے پیروں میں اس نے زنجیر باندھ رکھی ہے، وہ درویش اسے زمین کے سب خزانے نکال نکال کر دے دینے والا ہے۔

وہ درویش چپ تھا۔ اس نے طون کو بد دعا دینے کا ارتکاب نہیں کیا تھا۔ اس نے طون کے لیے ہدایت کی دعا کی تھی۔ ہر بار اسے خزانہ پکڑاتے ہوئے وہ اتنا ضرور کہتی تھی۔

"تمہارے صندوقوں میں بند دنیا جہاں کے خزانے بھی تمہیں موت سے نہیں بچا سکیں گے۔"

"تو کیا میں مرنے والا ہوں......؟"

"ہم سب مرنے والے ہیں...... کیا کوئی ہمیشہ زندہ رہا ہے......"

"دیکھا جائے گا......"

دوسری اور آخری قسط

''دیکھ لیا جائے گا...... ہر اس انسان کو، جس نے حدیں پار کیں......''

بارشوں نے جنگل میں بہت سے حشرات کی بہتات کر دی تھی۔ حبشی تک عاجز آ چکے تھے۔ لیکن طون باز نہیں آ رہا تھا۔ وہ ایسی جنگلی اندوہناک بارشوں میں بھی تحمل رکھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ دس دن تک کچھ ہاتھ نہیں آیا تو وہ ایک ایک کو کوڑے مار، مار کر جنگل کی طرف ہانک رہا تھا...... دھاڑ رہا تھا...... چلا رہا تھا......

اور پھر اسی وقت...... اس کی پنڈلی کے ساتھ ایک زہریلا سانپ لپیٹ گیا۔ وہ ایسا زہریلا سانپ تھا کہ حبشی تک اسے دیکھ کر بدک کر پیچھے ہٹے تھے۔ آگے بڑھ کر عزیزہ نے ایک وزنی پتھر اٹھا سانپ کو مارا تھا، لیکن وہ تب تک اس کی پنڈلی میں اپنا زہر اتار چکا تھا۔ اس کا رنگ نیلا پڑ چکا تھا، اور وہ بس ایک ہی بات ہکلا رہا تھا۔

''عزیزہ...... مجھے بچا لو...... مجھے...... اپنے خدا کے لیے...... اپنے خدا سے کہہ کر مجھے بچا لو......''

عزیزہ، حیران پریشان اس فرعون صفت انسان کو دیکھ رہی تھی، اسے خدا یاد بھی آیا تو عزیزہ کا۔ اپنے خدا کو وہ بھول چکا تھا۔

''سب کو آزاد کر دوں گا...... وعدہ...... مجھے بچا لو......''

حبشی اس کی ٹانگ میں خنجر سے کٹ لگا کر خون نکال رہا تھا، وہ بھاگی ہوئی گئی اور وہ ساری جڑی بوٹیاں اکٹھی کرنے لگی جو وہ اپنے زخموں پر لگاتے تھے۔ کسی زہریلے کیڑے کے کاٹ لینے سے، کسی زہریلے زخم کے پھیل اور ناسور بن جانے پر۔

ایک بچی نے اس کا ہاتھ منت سے پکڑ لیا۔ ''خدا کے لیے عزیزہ! یہ ظلم نہ کرو۔ مر جانے دو اسے، یہ ہمیں آزاد نہیں کرے گا۔ یہ جھوٹا ہے، یہ مکر کر رہا ہے۔ موت کو دیکھ کر ڈر رہا ہے۔''

عزیزہ نے ایک لمحہ رک کر سوچا۔ وہ طون کی بند ہوتی آنکھوں کی طرف دیکھ رہی تھی اور پھر...... پھر...... حق کی طرف......

''بروں کا حق ہے وہ کہ وہ برے بنیں۔ جو چاہیں کریں اور جو حق پر ہوں ان پر فرض ہے کہ وہ صرف وہ کریں جس کا حکم ہے...... ''رحم......'' (کلام حق)

☆ ...... ☆ ...... ☆

ہاتھوں کے زخم چھپا کر رکھنے پر بھی اسے کاموں سے نکال دیا گیا تھا۔ چکی کا کام تو اس نے خود چھوڑ دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ یہ بیماری وبا بنے۔ پانی بھرنا بھی چھوڑ دیا تھا لیکن باغ کی صفائی...... گھاس کی کٹائی...... پودوں کی دیکھ بھال...... کیا وہ یہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

نہیں...... کیونکہ باغ والے نہیں چاہتے تھے کہ وہ ایسا کرے۔ پھر اسے چند ایسے بیماروں کے کپڑے دھونے کا کام مل گیا، جن کے کپڑوں کو ان کے خونی رشتے بھی ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔ وہ ضعیف اور قریب المرگ لوگ تھے۔ ان کے خونی رشتوں کو اس کی پرواہ نہیں تھی کہ اس کی بیماری انہیں بھی لگ جاتی ہے یا نہیں۔ وہ تو پہلے ہی چاہتے تھے کہ وہ مر جائیں۔

نہ مراد کی بھوک زیادہ تھی، نہ جنت کی کوئی خواہش تھی۔ دونوں دن میں ایک وقت کا کھانا کھاتے تھے۔ زندہ تھے، کافی تھا۔ سکے

اسے مراد کی دوا کے لیے چاہیے تھے۔ ہر پندرہ دن بعد وہ کسی نہ کسی طبیب کی تلاش میں جایا کرتی تھی۔ مراد کو اللہ کے حوالے کر کے، وہ دیوانوں کی طرح طبیب ڈھونڈا کرتی تھی۔ کوئی مل جاتا تھا تو اس کے ساتھ آنے کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا۔ جو آنا چاہتا تھا وہ سفر کے خرچ کا مطالبہ کرتا تھا جو جائز بھی تھا۔ جو صرف دوا دے دیتا تھا، وہ دوا مراد پر کوئی اثر نہیں کرتی تھی۔ بیمار کا معائنہ ہی نہیں کیا جائے گا تو مرض کیسے پکڑا جائے گا۔ بے قراری کے میدان میں وہ یہاں وہاں، ادھر ادھر، بھاگی پھرتی تھی۔

''تم خود کو ہلکان نہ کرو جنت! میں خوش باش ہوں......'' مراد ہنسنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔

''تمہیں ایسے دیکھ کر میں خوش نہیں ہوں......''

''ابھی ہو جاؤ گی۔ اچھا ذرا بتاؤ عزیزہ اور آمنہ میں سے تمہیں سب سے زیادہ کس سے پیار ہے؟'' اسے خوش کرنے کے لیے وہ اکثر پوچھ لیتا تھا۔ دونوں اکثر رات کی اس کوٹھری میں، رات گئے تک باتیں کیا کرتے تھے۔

''بھلا پاگلوں سے بھی کوئی پیار کرتا ہے......'' کہہ کر اس نے قہقہہ لگایا اور پھر......پھر وہ رو دی......

''درویش نے کہا تھا کہ عزیزہ کی جرات ایسی ہے کہ اپنا دل بھی نکال کر رکھ دے گی......اور آمنہ......اس کا صبر ایسا ہے کہ پہاڑوں کا سینہ شق کر دے گا۔''

صابر آمنہ......

اس نے تدبر کا سینہ شق کر دیا تھا۔ کسوہ کے لیے اس نے غور فکر کے سب غار، اہرام (بلند) کر لیے تھے۔ کسوہ کی تعلیم و تربیت میں اس نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ جہاں سے جتنی کتابیں ملی تھیں، وہ سب اس نے پڑھ لی تھیں۔ اس نے کسوہ کو ایسے تیار کیا تھا جیسے جہاد نفس میں، مومن تیار ہوتا ہے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ آزمائش میں کسوہ کی سکی ہو۔ یا کسوہ کو ہی یہ محسوس ہو کہ اس کی مرحومہ والدہ کا خواب آمنہ کی وجہ سے ادھورا رہ گیا۔ والدہ حیات ہوتیں تو وہ یہ مقام و مرتبہ ضرور پا لیتی۔

چار سال پہلے وہ خود بھی حافظ قرآن ہو چکی تھی۔ کسوہ کے امتحان کے مہینے میں اس نے رات دن، اٹھتے بیٹھتے قرآن پڑھا تھا۔ آزمائش کے دن اس نے نماز تہجد سے نماز فجر تک دعا کا راستہ نہیں چھوڑا تھا۔ والدہ کسوہ بھی یہی کرتی نا۔ اس نے شہر کے حاجیوں کو، شہر کے کاروان حج کو پیچھے سے خیر کی دعائیں دی تھی۔ آج اسے اپنی بیٹی کی کامیابی کے لیے دعائیں چاہیے تھیں۔ شہر کی کتنی ہی بچیاں مدرسے میں آزمائش کے لیے تیاری کر رہی تھیں، وہ سب کی کامیابی کے لیے دعا کر رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کامیاب ہو جانے والے فلاح یاب بھی ہو جائیں۔ وہ بامراد بھی ہو جائیں۔

کسوہ کے بعد اس کی اپنی آزمائش بھی تھی۔ بچی کے ساتھ اس کی ماں کا ہونا ضروری تھا۔ ضعیفہ بہت بوڑھی ہو چکی تھیں۔ کسوہ کو آمنہ کے حوالے کر کے وہ تارک الدنیا ہو چکی تھیں۔ گھر بار سب کچھ سوتنوں پر چھوڑ دیا تھا۔ انہوں نے بھی گھر کے دو کمرے ان تین لوگوں کو دے کر، باقی کا سب کچھ سمیٹ لیا تھا۔ ضعیفہ کی عاجزی اور سخاوت، آمنہ کی لیاقت، شعور، نیک طبیعت لوگوں میں بہت مقبول تھی۔ لوگ اس کی عزت کرتے تھے۔ اسے کسوہ کی والدہ کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ سب کا ماننا تھا کہ اگر کسوہ جیسی بچی مدرسے کے امتحان میں کامیاب نہیں

ہوئی تو پھر کوئی بچی نہیں ہوگی۔

وہ اپنے امتحان میں کامیاب ہو چکی تھی۔ مدرسے کے عالم اور اساتذہ اس سے بہت خوش تھے۔قرآت، تلفظ، خوش الحانی، دین پر اس کی معلومات، کسوۃ الکعبہ سے عقیدت، حج کی بنیادی معلومات سے وہ متاثر ہوئے تھے۔ ہر بات کسوہ کے دل سے نکلتی تھی۔اس نے کوئی سبق یاد نہیں کیا تھا، ہر سبق سمجھا تھا، جانا تھا، پہچانا تھا۔اس کے پاس علم تھا، رٹا نہیں۔ پھر والدہ کا امتحان تھا۔والدہ بھی تیار تھیں۔غور و فکر......اس کے پاس ایک یہ استاد ہمیشہ رہا تھا۔اور اس استاد نے اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔

استاد نے اسے ناکام نہیں ہونے دیا تھا۔کسوہ کی طرح اسے بھی تعریفی سند ملی تھی۔کسوہ کو غلاف کعبہ کی تیاری کے لیے مدرسے میں داخل کر لیا گیا تھا۔وہ اتنی خوش تھی کہ خوشی سے کچھ کھا نہیں سکی، رات کو سو نہیں پائی۔وہ آمنہ اور عزیزہ سے باتیں کرتی رہی تھی۔

''جس غلاف کعبہ کو دیکھنے کے لیے ہم تڑپ رہی تھیں، وہ غلاف میری بیٹی بھی بنانے والی ہے۔اعزازی طور پر ہم کسوۃ الکعبہ کو قریب سے دیکھ سکیں گے۔ہم کاروان کے ساتھ حج کے لیے بھی جائیں گے۔تم نے دیکھا عزیزہ !وقت کیسے بدلا۔دیکھا تم نے میرا مقام اور رتبہ اللہ نے کیسے بدل دیا......''

مقام اور رتبہ......حسب اور نسب......

مخمل کے کپڑے پر لکھا ہوا حسب نسب ......والد، والدہ، دادا، دادی، نانا، نانی۔کسوہ کا حسب نسب تیار تھا، وہ دے دیا گیا تھا۔والدہ مرحومہ کے ساتھ والدہ آمنہ کا نام بھی لکھا تھا۔آمنہ نے یہ حسب نسب خود استادوں کے سامنے رکھا تھا۔وہ جانتی ہی نہیں تھی......وہ جانتی ہی نہیں تھی کہ یہ سوال بھی ہوگا......

''والدہ آمنہ کا حسب نسب؟''

''میرا حسب نسب؟'' سامنے پانچ عالم دین بیٹھے تھے۔دوسری طرف نامی گرامی استاد۔سامنے آمنہ دوزانو بیٹھی تھی۔

''آپ نے تربیت کی ہے بچی کی......اس کی حقیقی والدہ تو وفات پا چکی ہیں۔'' وہ اپنی بات کی وضاحت کر رہے تھے۔

آمنہ نے گردن موڑ کر ضعیفہ کو دیکھا، وہ نابینا ضرور تھیں لیکن بہری نہیں۔آمنہ کے دل کی دھڑکن پا گئی تھیں۔

'آمنہ میری بیٹی جیسی ہے......''

''بیٹی جیسی کا حسب نسب کہاں ہے؟ خادمہ نے ماں بن کر پالا ہے تو حسب نسب تو ہوگا۔والد، والدہ کا نام، شہر۔'' وہ چڑ گئے۔

آمنہ کو تو چپ ہی لگ چکی تھی۔جس وقت ابن منصور طوائف طوائف چلا رہا تھا، اس وقت اس کے دل میں ایسا وبال مچا تھا۔وہ وبال پھر سے اس کے دل میں اٹھا تھا۔

''کیا آمنہ اپنی آزمائش میں کامیاب نہیں ہوئی؟ ہر سوال کا جواب نہیں دیا؟ دین کی سمجھ بوجھ ظاہر نہیں کی؟'' ضعیفہ نے پوچھا۔

''خاتون آپ کے لیے ایک سوال کتنی بار دہرانا پڑے گا کہ ہمیں ہر بچی کا حسب نسب چاہیے، اگر والدہ آمنہ نے پرورش کی ہے تو ان کا چاہیے۔''

''کیا غلافِ کعبہ حسب نسب مانگتا ہے......؟''

سب نے حیرت سے اس نابینا عورت کو دیکھا۔''آپ کا احترام جائز ہے لیکن گستاخی ہم سے بھی نہ کی جائے۔''غصے سے کہا۔

''کسوہ حافظِ قرآن ہے، قابل بچی ہے۔آمنہ کا علم اور تدبر کسی سے کم نہیں ہے۔حسب نسب کی ضرورت ہی کہاں رہتی ہے۔''

''خاتون آمنہ! آپ اپنا حسب نسب دے رہی ہیں یا نہیں۔''اب غصے سے آمنہ سے پوچھا گیا۔

''کیا دینا ضروری ہے؟ کیا کسوہ کو اس کے بغیر......''زبان اٹک گئی۔آواز بند ہوگئی۔

''والد کا نام......والدہ کا نام......والد کا پیشہ......''اس کا سوال کا جواب دینے کی بجائے یہ سوال کیا گیا تھا۔

آمنہ کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔سب اسے دیکھ رہے تھے۔وہ مدرسے کی اونچی چھت کے نیچے بہت چھوٹی ہوگئی۔رنگین کھڑکیوں نے اس کے سارے رنگ نچوڑ لیے۔قالین میں دھنسے اس کے پاؤں ریت کے دلدل میں دھنسنے لگے۔یہ کہانی تو وہی پرانی تھی۔تو کیا کہانیاں بھی لوٹ لوٹ کر آتی ہیں۔کبھی اپنا آغاز اور انجام نہیں بدلتیں۔اس کا صابر دل، اس کی انکسار روح......وہ بڑی شدت سے رو دینے کو ہو چکی تھی۔پیچھے دوسری بچیاں اور ان کی مائیں بیٹھی تھیں، اسے ان سے بڑی شرم آئی تھی۔

''خاتون آمنہ......''اس کی طرف سوالیہ دیکھ کر پکارا جا رہا تھا۔

کسوہ نے حیرت سے اپنی ماں کو دیکھا، اب تک تو وہ ہر سوال کا جواب دیتی آئی تھیں، وہ اب کیوں خاموش تھیں۔اب تک انہوں نے کتابیں کھنگال کھنگال کر اسے کیا کچھ نہیں سیکھا دیا تھا......اب یہ خاموش ہیں......

آمنہ نے کسوہ کی طرف دیکھا۔اس کی مرحومہ ماں کا خواب، اس کی زندہ ماں کے ہاتھوں بکھرنے جا رہا تھا۔

''بتاؤ آمنہ! بتا دو سب کو......بتا دو کہ اس ہونہار، حافظِ قرآن بچی کی تربیت تم نے کی ہے۔مجھے تم پر فخر ہے آمنہ! کسوہ کو تم پر فخر ہے......بتا دو......''نابینا ضعیفہ نے آواز بلند کی۔وہ دیکھ سکتی تھیں جو کم ہی لوگ دیکھ سکتے ہیں۔

آمنہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔''میں والد کو جانتی ہوں، نہ والدہ کو......میں ایک رب کو جانتی ہوں......بس......''

''یتیم اور مسکین ہیں آپ؟ کیا جانتی ہیں ان کے بارے میں......؟''

''کچھ نہیں جانتی......کچھ بھی نہیں......بس اتنا جانتی ہوں کہ ہوش سنبھالا تو خود کو طوائف پایا اور دنیا کو تماش گر......گھر کو قحبہ خانہ اور جسم کو گناہ آلود......درویش ملے تو توبہ کی، قحبہ خانہ چھوڑ دیا پھر حج کے لیے کاروان کے ساتھ شامل ہوگئی......''

اتنا سنا کس نے تھا......بس طوائف تک ہی سنا تھا سب نے......بس......

''طوائف......''ان میں سے کسی ایک کی آواز بلند ہوئی تھی۔پیچھے سے بھی......دائیں، بائیں سے بھی......

''آمنہ کی سچائی کا ثبوت یہ بچی کسوہ ہے، جس نے مدرسے کے امتحان میں سب میں سے امتیازی کامیابی حاصل کی ہے۔''کسوہ کی نانی دلیلیں دے رہی تھیں۔لیکن انہیں سن کون رہا تھا......سب تو دیکھ رہے تھے......

''طوائف'' کو......

دوسری اور آخری قسط

بھری دنیا میں ...... اللہ کی بنائی دنیا میں ...... اتنے انسانوں میں ......

ایک اللہ کے لیے ...... ایک اللہ والی ...... اکیلی رہ گئی ......

☆ ...... ☆ ...... ☆

طون ...... وہ زندہ بچ گیا تھا ...... بستر مرگ سے وہ دوبارہ ان کے سروں پر آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ انہیں آزاد کرنے سے پہلے اس نے صرف چھ اور مہینوں کا کام لیا تھا۔ اور جب وہ انہیں آزاد کر رہا تھا تو اس نے بس اتنا کہا تھا۔ وہ زبان سے پھر انہیں تھا اور زبان پر قائم بھی نہیں رہا تھا۔ موت نے بس اسے اتنا ہی نرم دل رہنے دیا تھا۔

''عزیزہ! تمہیں تمہارے رب کی قسم ہے، پورے ایمان سے بتاؤ کیا تم ان لوگوں کو آزاد دیکھنا چاہتی ہو؟''

عزیزہ نے ناسمجھی سے طون کی سمت دیکھا۔ وعدے کے چھ مہینے پورے ہو چکے تھے۔ جتنا نکال کر دے سکتے تھے، اتنا وہ دے چکے تھے، اب یہ انسان اور کیا چاہتا تھا۔

''ہاں ...... کیوں ......؟''

''تو پھر یہ سب ایک شرط پر آزاد ہوں گے اور وہ شرط ہو تم ...... میں ان سب کو آزاد کر دوں گا، کبھی کوئی غلام منڈی سے نہیں آئے گا، یہ جنگل کسی دوسرے انسان کی بو نہیں پائے گا ...... اگر تم اللہ کو حاضر ناضر جان کر کہو کہ تم مجھ سے غداری نہیں کرو گی اور ......''

عزیزہ کا سانس رک گیا۔ ''کیا کہنا چاہتے ہو ......؟''

وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ میں نے کہہ دیا تھا کہ میں آزاد کر دوں گا، اور میں آزاد کر بھی رہا ہوں۔ لیکن تمہیں بھی کروں گا یہ نہیں کہا تھا۔ خزانے کی اصل چابی تم ہو، اب تک بھی سارے کام تم ہی کرتی رہی ہو، تو پھر اتنی بھیڑ کا تر دپالنے کی کیا ضرورت تھی۔ موقعہ ہاتھ آیا تھا تو وہ ان سب کی جانوں کے بدلے میں اس سے عہد لے سکتا تھا۔

''تم نے کہا تھا تم آزاد کر دو گے۔'' عزیزہ نے اس وعدہ خلاف انسان کو حیرت سے دیکھا۔

''کر تو رہا ہوں ......'' موت سے ڈر کر معافی مانگنے والا، زندہ رہنے کے بعد معافی سے مکر رہا تھا۔

''فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے، ان سب لوگوں کی جان، آزادی یا پھر ایک صرف تم؟ تمہاری غلامی ...... جواب دو عزیزہ ......''

عزیزہ نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ ہاں آزادی اتنی جلدی ممکن نہیں ہوتی۔ ہاں ...... فطرت اتنی جلدی نہیں بدلا کرتی۔ اس نے سب کی سب آمنہ اور جنت کی طرف دیکھا۔ معصوم چہروں اور زخموں سے چور چور جسموں کی طرف۔ چھ مہینے کے وعدے پر انہوں راتوں کو خواب کر دیا تھا، دن کو پرواز۔ ایسی درندگی، ایسی غلامیت سے نجات کے خیال نے انہیں کیسے نیم دیوانہ سا کر دیا تھا۔ اور وہ عورتیں ...... مصیبت زدہ ...... دکھی ...... بیمار ...... گیلا جنگل، گھنا جنگل، کٹیلا ...... اور درندہ جنگل ......

''ٹھیک ہے ......'' اس نے کہا ...... ''مجھے منظور ہے ......''

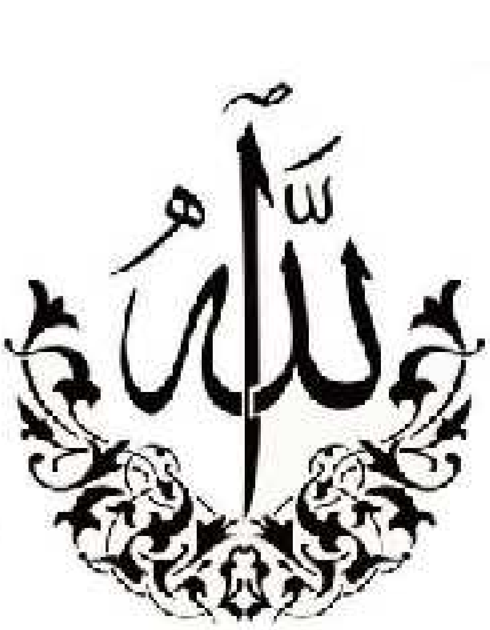

''تم کوئی چالاکی نہیں دکھاؤ گی ...... تم بھاگو گی نہیں......''

''میں بھاگوں گی نہیں......'

''اپنی زبان کا عہد دو......''

''اپنی زبان کا عہد دیتی ہوں......''

''اپنے رب کے نام سے دو......''

''اپنے رب کے نام سے دیتی ہوں......''

سب آزاد ہوئے......وہ غلام ہوئی......عزیزہ......بنت درویش......وہ قربان سر عام ہوئی......

☆ ...... ☆ ...... ☆

''اور تمہیں کیا چاہیے......؟'' آمنہ عزیزہ سے پوچھ رہی تھی۔ وہ خواب دیکھ رہی تھی۔

''مجھے......عزیزہ نے سوچا۔ ''مجھے ''حق'' چاہیے۔''عزیزہ نے اس کے گال چھو کر کہا۔

دین حق ہے......جیسے انسان کی پیدائش حق ہے......جیسے اس رب کی مرضی ''حق'' ہے

پھر ناحق کیا ہے؟ کسوہ کو مدرسے میں جگہ نہ دینا۔صرف اس لیے کہ اس کی پرورش کرنے والی ماں کا حسب نسب عالی مرتبہ نہیں تھا۔انسان سارے پیمانے بنا سکتا ہے،لیکن وہ ایمان کی پیمائش کا پیمانہ نہیں بنا سکتا۔ پھر......اس پیمانے پر پرکھ کر وہ، کسی کو بھی رد کیسے کر سکتا ہے۔کسوہ کی ہم عمر بچیاں جو اس کے ساتھ مدرسے میں امتحان کے لیے گئی تھیں، وہ غلاف کعبہ کی تیاری میں شامل کر لی گئی تھیں۔کسوہ نے افسردہ صورت والدہ سے اپنے بارے میں پوچھا تو والدہ رو دی۔

''مجھے معاف کر دو کسوہ! تمہاری ماں کا خواب، میری وجہ سے ادھورا رہ گیا۔''

کسوہ اور کبریٰ، آمنہ کو قصوروار سمجھنے کی گستاخی نہیں کر سکتی تھیں لیکن آمنہ نے خود کو معاف نہیں کیا۔ان چھ سالوں میں وہ پہلی بار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔اس نے خود کو اتنا گرا ہوا تب بھی نہیں پایا تھا جب منڈی میں فروخت ہوئی تھی لیکن اب......اب وہ بہت بے کل ہوئی تھی۔تو کیا انہیں ہمیشہ ذلیل کیا جائے گا۔کیا انہیں کبھی عزت اور مرتبہ نصیب نہیں ہو گا؟ اسے ایسی چپ لگ گئی تھی کہ کسوہ تک اداس ہو ہو کر اسے دیکھتی تھی۔

''آپ نے کہا تھا لوگوں کو معاف کر دینا چاہیے۔مدرسے کے استادوں کو معاف کر دیں۔''

''میں نے سب کو معاف کیا، دنیا نے مجھے معاف نہیں کیا......''

''آپ نے کہا ہمارا معاملہ اللہ سے ہوتا ہے......ہمیں دنیا والوں سے کیا لینا دینا۔''

کچھ لینا دینا نہیں تھا لیکن وہ پھر بھی روتی رہتی تھی۔بات بے قدری کی نہیں تھی، اس زعم کی تھی کہ اب دنیا اس کی قدر کرنے لگے

گی ۔ بات شک کی تھی، اس وسوسے کی کہ کیا اللہ نے بھی اسے معاف کیا ہے یا نہیں ۔ یہ جو سفر تھا، یہ کسی اور ہی گمان میں ہی تو نہیں کٹا۔ اتنا کچھ کھو کر، کچھ بھی نہیں ملا...... کیا کچھ بھی نہیں؟

''میں نے کبھی اللہ سے سوال نہیں کیا، کبھی کوئی جواب نہیں مانگا، لیکن میں ایک سوال کا جواب چاہتی ہوں...... اپنی قدر کا...... آمنہ کی کیا قدر ہے یارب...... یا دکھا دے یا بتا دے......'' تین مہینے وہ یہ سوال، رات دن خدا سے کرتی رہی تھی۔

سب جواب نہیں ملتے، تو سب سوال ادھورے بھی نہیں رہتے ۔ بیماری جنت کے شانوں تک پہنچی تھی ۔ بروقت علاج سے پھیلنے سے بچ گئی تھی ۔ مراد کے لیے جو طبیب ملا تھا، اس کے لیے انہیں شہر چھوڑنا پڑا تھا۔ پھر اس شہر میں تھا ہی کیا۔ ایک کوٹھری...... بس...... اس نے بہت مشقتیں کاٹیں لیکن وہ مراد کو لے کر شہر سے ہجرت کر کے طبیب کے شہر چلی گئی تھی۔ اس شہر میں بھی کوٹھری نما گھر میں ہی رہنے لگی تھی لیکن اب کم سے کم یہاں طبیب اور دوا تو میسر تھی۔

ہجرت اسے راس آئی تھی۔ اس شہر میں اسے کرنے کے لیے بہت کام مل گئے تھے ۔ وہ طبیب اور دوا کا خرچ اٹھا سکتی تھی ۔ وہ مسکرا کر مراد کو دیکھ سکتی تھی۔ مراد روشنی اور ہوا کو سہنے لگا تھا۔ دوا اثر کر رہی تھی......

''جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تھا تو میں حیران رہ گیا کہ کوئی اتنا خوب صورت بھی ہو سکتا ہے۔''

''اور یہ بات تم مجھے اب بتا رہے ہو...... اتنے سالوں بعد......''

''مجھ جیسے بیمار کے منہ سے یہ بات سن کر تم کہاں خوش ہوتی جنت...... تعریف بھی بدبودار ہو جاتی۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ اسے کریہہ اور بدصورت ہی لگا تھا۔ کچھ چیزیں اور کچھ لوگ، شروع میں کتنے عجیب اور ناپسندیدہ لگتے ہیں۔ پھر...... پھر تو وہ جان عزیز ہو جاتے ہیں......

آمنہ، جنت کی جان عزیز...... عزیزہ...... وہ ہڈیوں کا پنجر بن چکی تھی۔ سر کے بال کیسے ہو چکے تھے نا؟ بچے دیکھتے تو ہنس دیتے۔ اس کا مذاق اڑاتے۔ حسن دلدل ہو چکا تھا۔ آنکھیں اندھیرہ ہو چکی تھی۔ زمین نے اپنا سینہ سی لیا تھا۔ وہ اسے ایک بھی موتی نکال کر دینے کے لیے تیار نہیں تھی۔ پہلے تو طون اسے برداشت کرتا رہا تھا، پھر وہ اسے کوڑے مارے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

''چالباز...... تم نے اپنے رب کے نام پر عہد لیا تھا کہ تم کوئی چالاکی نہیں کرو گی۔''

''میں کوئی چالاکی نہیں کر رہی طون! یہ تو زمین ہے جو مجھ سے ناراض ہے شاید......''

''مجھے اپنی انگلیوں کاٹنے پر مجبور نہ کرو عزیزہ! تمہاری درویشی پر میں نے ان سب کو آزاد کر دیا تھا، اب تم اپنی کمزوری دکھا کر میرے غصے کو دعوت نہ دو۔''

''میں کمزور نہیں، بے بس ہوں...... میرا زمین و آسمان پر کیا بس بھلا......''

''اگر یہ بس آج بھی نہ چلا تو میں تمہاری انگلی کاٹ دوں گا...... جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دوں گا......''

دس انگلیوں میں سے تین، تو ویسے ہی کاٹی جا چکی تھیں...... باقی کتنی بچیں...... سات......

وہ سات لوگ تھے، جو اس سے سوال پوچھتے رہے تھے۔ لیکن اب صرف وہاں وہ ایک تھے۔ وہ ایک آخری بار پھر مدرسے آئی تھی۔ وہ اپنے ساتھ اپنی پوری کہانی لائی تھی، لیکن وہ یہ کہانی سنانے والی نہیں تھی، اس نے بس ایک آخری بار درخواست کی تھی۔

''آپ بس یہ بھول جائیں کہ کسوہ کی پرورش میں نے کی ہے، میں اسے چھوڑ کر چلی جاؤں گی، آپ اس بچی کی مرحومہ ماں کی نیت کو تعبیر ہونے دیں۔ کسوہ کو اس سعادت سے محروم نہ کریں۔''

اس نے ہاتھ میں پکڑا پرچہ...... کپڑے کا ٹکڑا استاد محترم کی رحل پر رکھا...... کپڑا جو سیاہ تھا......

''جب ہم حج کے لیے نکلی تھیں تو ایک پڑاؤ کے دوران، ایک دیوار کی کھوہ میں مجھے یہ رکھا ہوا مجھے ملا تھا۔ عزیزہ نے کہا تھا کہ جو جس کی چیز ہوتی ہے، وہ اسے ہی ملتی ہے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ ہماری چیزوں کی حفاظت فرشتے ہمارے لیے کرتے ہیں۔ شاید وہ جذباتی تھی اور کم عقل بھی۔ میں نے بہت عجیب وغریب حالات دیکھے لیکن اپنے اس تحفے کو اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھا کیونکہ یہ میرے لیے تھا...... یہ میرا تھا...... عزیزہ نے اسے کلام حق کا نام دیا تھا۔ ہم نہیں جانتی تھیں کہ اس پر کیا لکھا ہے لیکن اس کا ماننا تھا کہ حج پر جانے والوں کو ''حق'' کے سوا دیا ہی کیا جا سکتا ہے۔ یہ تحریر حق ہے، یہ تحریک حق ہے...... یہ نصیب حق ہے...... لیکن وہ پاگل تھی۔ یہ کلام حق، تحریر حق ہو سکتا ہے لیکن اس پر میرا حق نہیں ہو سکتا...... یہ سیاہ ہے...... پہلے ہم تینوں کو شک تھا، ہم کسی سے پوچھتے ہوئے بھی ڈرتی تھیں لیکن بعد میں، مجھے یقین ہو گیا کہ یہ غلاف کعبہ کا ٹکڑا ہے۔ جو کسی درویش بزرگ کو نصیب ہوا تھا، اور انہوں نے اس پر تحریر لکھ کر، اسے کھوہ میں اپنے جیسے کسی حاجی کے لیے تحفے کے طور پر رکھ دیا تھا...... کسی حاجی کے لیے...... مجھ جیسی کے لیے نہیں...... تو یہ بھی آپ کا ہوا...... آپ کا اس لیے کہ اسی مدرسے کسوۃ الکعبہ جائے گا...... تو یہ بھی اسی کا حصہ ہے...... میں نے اپنی قدر جان لی، میں نے اپنے آپ کو پہچان لیا۔ اب آپ کسوہ کو پہچان لیں۔ اسے مدرسے میں جگہ دے دیں......'' کہتے کہتے وہ کیسے رو دی تھی۔

''تم کون ہو آمنہ......؟'' کلام حق استاد محترم، نگران محترم کے ہاتھ میں کانپ رہا تھا۔ وہ کتنے حیران تھے۔

''میں نے بتایا تو تھا کہ میں کون ہوں......'' اس نے بھیگی آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

''تم جانتی ہو یہ کس کا ہے......؟''

''میں بس یہ جانتی ہوں کہ یہ میرا نہیں ہے......''

کتنی ہی دیر تک سناٹا رہا تھا...... استاد کا سر جھکا رہا......

''میں نے مدرسے کے ہر رکن کو سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی آمنہ! میں تمہارے تدبر پر بہت حیران تھا۔ تمہارے شعور نے مجھے حیران کر دیا تھا، لیکن وہ پانچ تمہارے حسب نسب پر نہیں مانے تھے۔ وہ بار بار کہتے جاتے تھے کہ کعبہ کا غلاف ایک ایسی بچی کے ہاتھ سے نہیں بن سکتا، جس کی پرورش ایک طوائف نے کی ہو......'' کہتے کہتے ان کی آواز بھیگ گئی۔

''لیکن کسوہ...... میری کسوہ...... اس کا کیا قصور ہے......''

''قصور تمہارا بھی نہیں...... قصور تو ہمارا ہے...... قصور میرا ہے...... جانتی ہو یہ کلام حق کس کا ہے...... میرا...... یہ غلاف اسی

مدرسے میں بنا تھا۔ یہ مجھے تحفے میں دیا گیا تھا۔ اس میدان کاروان میں بیٹھ کر میں نے یہ تحریر لکھی تھی، اور پھر اسے تحفے کے طور پر رکھ دیا تھا۔ والد کہا کرتے تھے، مسافر کو اپنے نشان چھوڑتے رہنا چاہیے۔ قلم، کتاب، ورنہ اخلاص...... جو جس کا ہوگا، وہ اسے مل جائے گا۔ یہ تمہیں ہی کیوں ملا آمنہ! کیوں؟ والد کہا کرتے تھے، دنیا میں کسی انسان کی کہانی اتفاق سے نہیں لکھی جاتی۔ جو ذرے ذرے کا واقف حال ہے، وہ اتفاق کیوں کرے گا؟ وہ طے کرے گا...... کوئی چیز، کوئی واقعہ، اتفاق نہیں...... وہ طے شدہ ہے، ورنہ معجزہ ہے...... جس عورت کی بیٹی کو غلاف کعبہ بنانے کی سعادت سے محروم کر دیا گیا، سالوں پہلے اسی عورت کو "غلاف کعبہ" پہلے سے ہی عنایت کر دیا گیا...... جہاں اس سے حسب نسب کا سوال کر کے، خارج کر دیا گیا، وہیں اسے پہلے سے ہی عالی مرتبہ بنا دیا گیا...... تم کون ہو آمنہ......؟"

"میں کون ہوں؟ میری قدر کیا ہے...... میں خدا کے لیے کیا ہوں......" آمنہ کا سوال تھا۔

بے قرار بحر ہے...... بے قرار لہر ہے......

تیرا رب رحم ہے...... اور یہی تیری قدر ہے...... یہی تیری قدر ہے......

کلام حق پر لکھی تحریر...... آمنہ کے لیے لکھا حق......

اس کا سوال قدر...... رب کا جواب قدر......

☆ ...... ☆ ...... ☆

پیروں کی انگلیاں کاٹنے کے بعد، سلاخوں سے اس کا جسم داغنے کے بعد، وہ اس کی شہادت کی انگلی کو سختی سے دبوچے ہوئے کھڑا تھا۔ اس ایک انگلی کے لیے وہ پہلی بار سسک رہی تھی۔ اس کی منت کر رہی تھی کہ وہ اس ایک انگلی کو چھوڑ دے۔ اس کی شہادت کو چھوڑ دے۔ تائب ہوتے ہوئے اس نے اس انگلی کو اٹھا کر آسمان کی سمت بلند کیا تھا......

"میں نے تم پر بھروسہ کیا عزیزہ! تم نے میرا بھروسہ توڑا......"

"لالچ نے تمہیں اندھا کر دیا ہے طون! خدا کا خوف کرو......"

"خدا کا خوف کر کے ہی میں نے سب کو آزاد چھوڑ دیا تھا...... لیکن تم......"

"میں نے اپنا کوئی عہد نہیں توڑا...... لیکن تم توڑ رہے ہو......"

وہ ہمیشہ اسے وہاں چوٹ پہنچاتا رہا تھا جہاں سے تڑپ کر وہ اسے خزانہ نکال کر دیتی رہی تھی۔ وہ اب بھی اسی جگہ چوٹ پہنچا رہا تھا، جہاں سے تڑپ کر وہ اسے خزانہ نکال کر دینے کا عہد کرنے والی تھی۔ وہ کہے گی کہ میں تمہیں سارا جنگل خزانہ کر دوں گی۔ سارا جہاں کھود ڈالوں گی...... میری یہ انگلی چھوڑ دو...... وہ کہے گی، ورنہ......

"میری شہادت چھوڑ دو طون! ...... بس یہ...... ایک......"

☆ ...... ☆ ...... ☆

دوسری اور آخری قسط

ابن موسی نے اپنا کاروان بہت ڈھونڈا لیکن اسے اپنا ایک بھی حاجی نہیں ملا تھا۔صحرا کے بدووں سے دوبدو جنگ ہو چکی تھی۔خلیفہ نے اس کی سرپرستی کی تھی، بہت سوں کا صفایا کر دیا اس نے۔لیکن جب تک دنیا قائم ہے...... چور، ڈاکو، لیٹرے، قاتل یہ پیدا ہوتے ہی رہیں گے۔سانس لیں گے، سانسیں کاٹ دیں گے۔کیونکہ اگر چور، لیٹرے نہ ہوں تو ''امیر اور راہبر'' بھی نہ ہوں۔ایک بری چیز کا ہونا، دوسری اچھی چیز کی وجہ ہے۔دنیا بری جگہ نہیں، دنیا بروں اور اچھوں سے بھری جگہ ہے۔

امیر کاروان نے اپنا نعرہ حق بلند رکھا تھا، وہ امام کعبہ سے مل چکا تھا۔ان سے خطبوں میں ''دین حق'' کی تشریح کی درخواست کر چکا تھا۔وہ خود بھی سرزمین حجاز میں رہنے لگا تھا۔ہر سال حاجیوں کے لیے پانی، خیموں کا انتظام دیکھتا تھا۔وہ کاروان کا امیر نہیں بن سکتا تھا۔بننا بھی نہیں چاہتا تھا۔وہ حاجیوں کا خدمت گار بن چکا تھا...... کیونکہ...... اسے یقین تھا، جو حاجی اسے ساری دنیا کھنگال کر بھی نہیں ملے تھے، وہ یہاں ضرور مل جائیں گے۔جو حج کے لیے نکلے تھے، وہ حج کی سعادت ضرور پا جائیں گے......

مل جانے کے لیے...... بچھڑ جانا ضروری ہے......

خوشی سے اس کی سانسیں پھولی ہوئی تھی۔اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔وہ بھاگی ہوئی مراد کے پاس باغ میں آئی تھی، جہاں وہ پھلوں کی دیکھ بھال کا کام کرتا تھا۔اس کے جسم پر زخموں کے داغ موجود تھے لیکن بیماری جا چکی تھی۔وہ اتنا تندرست تو ہو ہی چکا تھا کہ رزق حلال کما سکتا۔

''مراد! جس گھر میں، میں کام کرنے کے لیے جاتی ہوں...... انہوں نے قرعے میں میرا نام لکھ لیا اور تمہارا بھی......''

''کس لیے میری جنت......؟''

کسوہ الکعبہ کے لیے...... کسوہ کے لیے...... وہ مدرسے میں داخل کر لی گئی تھی۔جو پہلے پیچھے رہ گئے تھے، وہ اب پیچھے نہیں رہے تھے۔باقی بچیوں کے ساتھ وہ کسوہ الکعبہ کی تیاری میں مصروف ہو چکی تھی...... اور آمنہ...... آمنہ...... اس نے حج کی تیاری کرنی شروع کر دی تھی۔اس نے سات سال اعمال حج جمع کیے تھے۔سفر حج کے لیے، نیت حج میں، اس نے رب کی محبت کے طواف کیے تھے......

طواف...... طواف عشق......

وہ جنگل میں ہوش سے بے گانہ پڑی تھی۔سارا جنگل پرندوں کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔دلدل زمین پر شور برپا تھا۔ایسا لگتا تھا جنگل پر بدووں کا حملہ ہو چکا ہے۔ہر چیز مٹ جانے کو ہے...... ہر چیز پھٹ جانے کو ہے...... ہر انسان ہلاک ہو جانے کو ہے......

آمنہ اور جنت...... وہ اس کے سر پر کھڑی تھیں...... اس کا منہ تھپک رہی تھیں۔

''میں نے تمہیں بہت یاد کیا...... بہت......'' وہ رو، رو کر کہہ رہی تھی۔

اس سے اٹھا نہیں جا رہا تھا، اس کے منہ میں پانی ڈالا جا رہا تھا۔اس کی شہادت کی انگلی بچ گئی تھی۔جس کی قیمت میں، اس نے اپنی غلامی دی تھی۔وہ طون سے ہاتھ چھڑوا کر بھاگ گئی تھی۔وہ اپنا عہد نبھانے کے لیے تیار تھی، خزانے کی مشقت جھیلنے کے لیے بھی تیار تھی لیکن ایسے نہیں۔وہ تین دن تک جنگل میں بھاگتی رہی تھی۔پھر نقاہت سے گر کر بے ہوش ہو گئی تھی۔جنگل رات ہوا تھا، جنگل دن ہوا تھا، جنگل

بارش ہوا تھا، جنگل دلدل ہوا تھا.......جنگل گواہ ہوا تھا اس عظمت کا جسے عزیزہ نے خود کو قربان کر کے پایا تھا.......

گھنا جنگل.......دانا جنگل.......خزانوں سے بھرا جنگل.......

جن غلاموں کو اس نے آزاد کروایا تھا، ان غلاموں نے اسے بھی آزاد کروا دیا تھا۔ طون اور اس کے خزانے ضبط کر لیے گئے تھے۔ اسے شہر کے ایک دانا کے گھر میں رہنے کی جگہ ملی تھی۔ یہیں طون کے جنگل سے آزاد ہوئیں آمنہ اور جنت بھی رہ رہی تھیں۔ وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوئی تو پھر سے اس جنگل میں گئی تھی۔ اب وہ آزاد اور تندرست تھی۔ اب وہ خود مختار اور دانا تھی۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر، زمین میں ہاتھ ڈالا.......اس کی نیت بڑی شفاف تھی.......اس کی نیت بڑی پاک تھی.......

زمین.......اس نے کبھی شفاف دلوں کے شفاف نیت ہاتھوں کو خالی ہاتھ نہیں لوٹایا.......

اس کی دس انگلیوں میں سے چار انگلیاں بچی تھیں۔ انہی سے وہ زمین کھود رہی تھی۔ دسویں دن، وہ شہر کے میدان کاروان میں، امیر کاروان کے پاس آئی تھی۔ وہ حج پر جانے والوں کے نام درج کر رہا تھا۔

''یہ ان لوگوں کا سفر حج کا خرچ، جو جانا چاہتے ہیں لیکن جا نہیں سکتے، جو نیت رکھتے ہیں لیکن سفر حج نہیں رکھتے.......''اس نے ایک پیش قیمتی ہیرا امیر کاروان کے سامنے رکھا.......اور پھر.......دوسرا.......دوسرا.......

''اور یہ.......یہ.......ان حاجیوں کے لیے جو جانا چاہتے ہیں لیکن کاروان سے نکال دیے جاتے ہیں.......آمنہ کے لیے.......جنت کے لیے.......اور عزیزہ کے لیے.......اب انہیں نہ نکالنا امیر! اب انہیں حج پر جا لینے دینا۔ انہیں ان کے رب کے گھر کا طواف کر لینے دینا۔ وہ نیک ہوں یا بد۔ وہ سیاہ کار رہے ہوں یا نیکوکار۔ ان کے لقب کچھ بھی ہوں، ان کی حیثیت کیسی بھی رہی ہو۔ اب انہیں ان کے گناہوں سے نہ پکارنا۔ اب کسی کو انہیں کنکر نہ مارنے دینا۔ کاروان حج کے حاجیوں سے کہہ دینا، جو حج کرتا ہے، وہ رب کے لیے کرتا ہے، اور اگر رب ہاتھ پکڑ کر باہر نہ نکالے تو تم بھی نہ نکالنا۔ انہیں بتا دینا امیر! کہ حج ہر صاحب چاہت پر فرض ہے.......ہر آمنہ پر.......ہر جنت پر.......اور ہر عزیزہ پر.......وہ ہمارا رب ہے، اس کی محبت کا طواف، ہر بندے پر فرض ہے.......''کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی.......

☆ ...... ☆ ...... ☆

حج فرض ہے، صاحب چاہت پر، صاحب عمل پر، صاحب بیدار پر.......

یہ فرض ہے.......صاحب حق پر.......حق پر.......حق پر.......

سرزمین حجاز پر کاروان اور قافلے آ رہے تھے۔ ہر طرف سوار اور سواریاں تھیں۔ ہر طرف حاجی اور ان کی نم آنکھیں تھیں۔

''جن کے نام لیے جا رہے ہیں وہ اپنی سواری لے کر کاروان سے الگ ہو جائیں.......''ایک آواز بلند ہوئی۔

جنت نے سہم کر مراد کو دیکھا تھا۔ ''تم گھبرا کیوں رہی ہو.......کوئی خاص وجہ ہو گی۔'' مراد نے تسلی دی۔

''خاص وجہ ہی ہوتی ہے جو کاروانوں میں صرف چند نام پکارے جاتے ہیں۔ انہیں الگ کیا جاتا ہے۔''اس کا رنگ زرد پڑ چکا تھا۔

''تم خواہ مخواہ وہم کر رہی ہو......''

وہ وہم نہیں کر رہی تھی......اس کا نام پکارا جا رہا تھا......جنت......جنت......جنت بنت درویش......

نیچے اتر کر مراد جنت کے اونٹ کی منہال تھام کر، کاروان میں سے دور......آگے......آگے لے کر جانے لگا......

وہ بہت پیچھے تھی......بہت پیچھے......دمشق سے آئی تھی......کاروان کسوۃ الکعبہ کے ساتھ......اس تک ایک آواز آئی تھی......

''آمنہ......آمنہ بنت درویش......ان کی سواری کہاں ہے......''

کسوہ پیچھے دمشق میں رہ چکی تھی، وہ عالم اسلام کے دوسرے بڑے کاروان کے ساتھ اکیلی آئی تھی۔ اسے اعزازی طور پر بھیجا گیا تھا......پھر......پھر اتنی عزت پر بھی......اس کا نام ایسے کیوں پکارا جا رہا تھا......اسے کاروان سے الگ کیوں کیا جا رہا ہے؟

سرزمین حجاز پر صبح و شام ہر حاجی کا استقبال کیا جاتا تھا۔ جس راستے پر کھڑے ہو کر ان کے لیے ہاتھ بلند کیے جاتے تھے، انہیں خوش آمدید کہا جاتا تھا۔ اس راستے پر ابن موسی بھی کھڑا ہوتا تھا، اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہوتے تھے۔ امام کعبہ کی اجازت سے وہ آنے والوں سے با آواز بلند یہ درخواست کرتے تھے، ہر سال کرتے تھے کہ جن کے نام پکار رہے ہیں، وہ حاجی کاروان سے الگ ہو جائیں۔

وہ حاجی......وہ تین حاجی......وہ امیر کے حاجی......

امیر کاروان اپنا کاروان ڈھونڈ رہا ہے۔ امیر کاروان حج کرنا چاہتا ہے۔ امیر کاروان، وہ صاحب حق ہونا چاہتا ہے۔

عزیزہ......بنت درویش......عزیزہ بنت درویش......

دور سے......بہت دور سے......عہد کے سات سالوں سے۔ صبر کے سات جہاں سے......عزیزہ......عزیزہ بنت درویش۔

سعی کی دوڑ سے......رضا کے وقوف سے......ان کی سواریاں، کاروان سے الگ ہوئیں۔ سارا کاروان رکا ہوا تھا۔ ایک ان کے تین اونٹ چل رہے تھے

آمنہ......جنت......عزیزہ......

ہر سال ابن موسی، ہر کاروان، ہر قافلے میں یہ نام بلند کرتا تھا۔ ہر سال وہ آنے والے حج کا انتظار کرتا تھا۔ تین اونٹ کاروان سے الگ ہوئے تو وہ......چٹان جیسا مرد......وہ ڈگمگا گیا......وہ اپنی آنکھیں نہیں جھپک سکا تھا......اس کا دل کیسے کانپ اٹھا تھا۔

''میرا حق آ گیا......میرا کاروان آ گیا......'' آنکھوں میں نمکین ستارے تھے۔ ابن موسی، امیر کاروان۔

وہ لپک کر تیزی سے اپنے کاروان کی طرف بڑھا۔ مراد کے ہاتھ سے جنت کے اونٹ کی منہال تھامی، اور پھر آمنہ کے اونٹ کی اور پھر عزیزہ کے اونٹ کی طرف بڑھ گیا۔ وہ تینوں ایک دوسرے کو رو، رو کر دیکھ رہی تھی۔

''امیر الحج......امیر کاروان......'' عزیزہ نے یہ نام پکارا تھا۔

''میرا کاروان......میرا کاروان......'' امیر کاروان نے اپنا لقب، اپنا مقام پا لیا تھا۔

ایک وہ کاروان تھا جس سے وہ اونٹ سے اتار دی گئی تھیں۔ ایک یہ کاروان تھا، اونٹ کی منہال امیر الحج نے، امیر کاروان نے خود

تھام رکھی تھی۔

وقت بدلتا ہے...... حق آتا ہے اور باطل مٹ جاتا ہے......

حق آیا...... حج ہوا......

امام کعبہ نے امیر کاروان ابن موسیٰ، خاتون کاروان، عزیزہ کا نکاح پڑھوا دیا تھا۔ امیر کا فوت شدہ دل، عزیزہ کے قبول ہے میں دفن ہو گیا۔ اللہ کے ساتھ معاملات طے پا چکے تھے، امیر حیات نے، امیر کاروان کو عزیزہ کے لیے پسند کیا تھا۔ لیکن اس سے پہلے، امیر کاروان نے، اپنے تین حاجیوں کے ساتھ حج ادا کیا تھا۔

وہ تینوں اپنے رب کے گھر کا طواف کر رہی تھیں...... لبیک کہہ رہی تھیں......

اور لبیک کہہ رہا تھا کلام حق...... کہ

''وہ جو ہمارا رب ہے، اس کی محبت کا طواف، ہر ذی روح پر فرض ہے۔''

☆ ...... ☆ ...... ☆

''حج فرض ہے ہر صاحب چاہت پر''